آم کے آم



انشائیے

رام لعل نابھوی

دوسرا ایڈیشن

آم کے آم

انشائیے

رام لعل نابھوی

دوسرا ایڈیشن مع اضافہ

Aam ke Aam

Author

Rs
35/-
2nd Edition

Ramlal NABHA
Dewan Street
NABHA (Pb)

آم کے آم

انشائیے

رام لعل نابھوی

دوسرا ایڈیشن معہ اضافہ

مُصنّف : رام لعل نابھوی۔ محلہ دیوان، نابھا ۲۰۱ ۱۴۷۔ پنجاب (انڈیا)
قیمت : پینتیس روپے -/۳۵
کتابت : جمال گیاوی

باراوّل : ۱۶ر ستمبر ۱۹۸۳ء
بار دوئم : یکم جنوری ۱۹۸۶ء

تقسیم کار :
انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) اُردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ناشر : رام لعل نابھوی۔ محلہ دیوان، نابھا ۲۰۱ ۱۴۷۔ پنجاب (انڈیا)

(جے، کے، آفسیٹ پریس، دہلی)

آم کے آم

رام لعل نابھوی

ڈاکٹر وزیر آغا کے نام



رام لعل نابھوی

عَرضِ مُصنّف

میری پہلی کتاب "تبسّم" طنزیہ مزاحیہ خاکوں پر مشتمل تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۷۹ء میں، دوسرا ایڈیشن اضافہ کے ساتھ اپریل ۱۹۸۳ء میں، اور تیسرا ایڈیشن معہ مزید اضافہ جنوری ۱۹۸۶ء میں شایع ہوا۔

"آم کے آم" میری دوسری تصنیف ہے۔ جو انشائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ ہے۔

اس کتاب کی جلدیں سرکار کی وزارتِ خارجہ اور وزارتِ دفاع نے خریدیں۔ پنجاب اور ہریانہ سرکاروں نے لائبریریوں کے لیے جلدیں خریدیں۔ پنجاب، ہریانہ اور ہماچل سرکاروں نے اپنی اپنی ریاستوں کی لائبریریوں کے لیے منظور کی۔

اس کتاب پر بہار اُردو اکادمی نے ایک ہزار روپیہ، ہریانہ ساہتیہ اکادمی نے پندرہ سو روپیہ انعام دیا۔ محکمہ السنہ سرکار پنجاب نے طباعت کا پہلا انعام ایک ہزار روپیہ دیا۔

ترتیب

اِنشائیہ

اِنشائیہ

فن انشا دوسرے فنون کی طرح وسیع اور مختلف النوع ہے۔ اصطلاح میں اس کا اطلاق اِنشاء نثر اور اِنشاء کتابت پر ہوتا ہے۔

اِنشاء کے لغوی معنوں پر نظر ڈالیئے۔ اِنشاء۔ عبارت لکھنا۔ کوئی بات دل سے پیدا کرنا۔ شروع کرنا۔ طرزِ تحریر۔ عِلم منطق میں وہ کلام جس میں صِدق کذب کا احتمال نہ ہو۔

نامۂ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا ۔۔۔ خط کی اِنشا اور ہے لکھنے کی اِملا اور ہے (رشک)

وہ کتاب جس میں مختلف خطوط کے نمونے اور خط لکھنے کے قاعدے لکھے ہوں۔ اس کو بھی انشا کہتے ہیں جیسے اِنشاء طاہر وحید۔ اِنشاء خلیق۔ مفیدُ الاِنشاء وغیرہ۔

قاتل کو اپنے حال لکھوں گا کہاں تلک ۔۔۔ خط کی جگہ مَیں بھیج دوں اِنشا قتیل کی (تسلیم)

اِنشا کرنا۔ تحریر کرنا۔ لکھنا۔

خون روتا ہے ہر اک حرفِ غلط پر ہمدمو ۔۔۔ اور اب رنگین جیسا تم کہو انشا کروں (اِنشا)

اِنشاء پرداز، منشی، نثار۔

غرق گرداب یم فکر ہو اِنشاء پرداز ۔۔۔ اے نصیر اپنے دکھاؤں جو میں تقریر کے پیچ (نصیر)

اِنشائیہ کا تصور انگریزی ایسے سے وابستہ ہے۔ مشرق کی ادبی اصناف میں اس کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ اُردو کی بہت سی اصناف غیر زبانوں سے آئی ہیں۔ اِنشائیہ ان میں سے ایک ہے۔ اُردو اِنشائیہ کی اقدار کا تعین کرنے کے لیے ہمارے

پاس کوئی پیمانہ نہیں۔ کیونکہ اس کے موجودہ قوانین وضوابط براہ راست مغرب سے آئے ہیں۔ چنانچہ اس صنف کی وضاحت مغرب کے انشائیہ نگاروں کے خیالات، حوالجات، تحریروں کے اقتباسات سے ہی ہوسکتی ہے۔ اُردو ادب کی اصطلاح انشائیہ انگریزی ادب کی صنف لائٹ ایسے کے مترادف ہے۔

آیئے پہلے ایسے کے آغاز اور ارتقاء پر طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

خالص ایسے کی ابتدا فرانس میں مونتین نے کی۔ اس نے اسے باقاعدہ ایک صنف کی شکل دی۔ اپنے انشائیوں میں شخصیت کے اظہار پر زور دیا۔ مونتین نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ایسیز لکھی۔ انگلستان میں بیکن نے مونتین کے سترہ سال بعد انگریزی میں ایسے لکھے۔ انگریزی میں ایسے کا لفظ فرانسیسی لفظ ایسیز سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ فرانس میں ایسے کا موجد مونتین اور انگلستان میں ایسے کا موجد فرانسس بیکن کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ سرٹامس براؤن، ایڈیسن، گولڈسمتھ، ہزلٹ، اسٹیل، چارلس لیمب، اسٹیونسن، میکالے رسکن، پیٹر، چسٹرٹن، گارڈنر، رابرٹ لنڈ، ڈرائیڈن، جانسن، کارلائل، ڈی کوئنسی، جیروم، ہکسلے، ہربرٹ وغیرہ نے اس صنف ادب کو فروغ دیا۔ اُنیسویں صدی میں انگریزی ایسے اپنے نکھار پر آئے اور بیسویں صدی میں یہ فن عروج پر پہنچا۔

مغرب کے مدبرین نے ایسے کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے کئی تعریفیں دی ہیں۔

جانسن کا مقولہ ہے کہ ایسے ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے۔ جس میں ایک مخصوص بے ربطی ہوتی ہے۔

اوسبورن کے لفظوں میں ایسے، کسی وقتی اہمیت کے موضوع پر ہلکی گپ شپ ہے۔

جی۔ بی۔ پرسٹلے ایسے کو جبلی شخصیت کا پُرخلوص اظہار اور پُرفن بات چیت کا نام دیتا ہے۔

جے۔ بی۔ مورٹن کے قول کے مطابق ایسے نثر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔

رابرٹ لنڈ کا قول ہے کہ ہم انشائیہ نگار سے صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ اپنی طرزِ تحریر سے خوش کرے اور اپنے موضوع کو اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی میں پیش کرسکے۔

ارل اوف برکن ہیڈ نے خالص ایسے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے باغیچے، گھر یا دوستی سے لطف اندوز ہوتا ہے بالکل اسی طرح ایک مفکر، ادیب علم و ادب کی انتہائی سنجیدہ فضا سے باہر آکر اور خود کو ذہنی فراغت کی کیفیت میں مبتلا کرکے اپنے ہی افکار سے محظوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔

مونتین نے انشائیہ کو ذاتی تصویر کا خطاب دیا ہے۔

مُرے نے اپنی لغت میں انشائیہ کے معنی اس ادبی تخلیق کے لکھے ہیں جو کسی موضوع پر بہت مختصر ہو اور ساتھ ہی اس میں عدم تکمیل موجود ہو۔ اس کا اسلوب واضح ہو اگرچہ اس کی وسعت محدود ہو۔

کریبے کی نظر میں یہ ایک آسان فن ہے۔

سینٹ بیوو کے خیال میں یہ ایک مشکل فن ہے۔ وہ انشائیہ کو نرحت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

کچھ ناقد ایسے میں خود کلامی کے عناصر بھی شامل کرتے ہیں۔

ایک انگریزی نقاد نے انشائیہ کی تشنگی کو اس کی ضروری خصوصیت قرار دیا ہے۔

انشائیہ کی یہی خصوصیات یعنی اختصار، تحریر کی غیر سالمیت، بیان میں سادگی، بے تکلفانہ پن اور شخصی ہونا کم و بیش اُردو انشائیہ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ جن کی مدد سے انشائیہ کے مزاج، موڈ اور تکنیک سے متعارف ہوا جا سکتا ہے۔

جہاں تک اختصار کا تعلق ہے۔ یہ ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ایسے لکھنے والوں نے اختصار کی مختلف حدود قائم کی ہیں۔

ہاؤس پیٹرسن "ایسے کیسا ہو" کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس صنف ادب پر لکھی ہوئی تحریر بیس یا تیس صفحات پر مشتمل ہوگی۔

والٹیر کے ہاں اختصار یا طوالت کی قید نہیں۔

مُل اختصار پر زور دیتے ہیں۔

رابرٹ لنڈ اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔

بقول ہڈسن اگر انشائیہ لکھنے والے نے اس لیے اختصار سے کام لیا ہے کہ اس کے پاس کہنے کی باتیں ہی گنتی میں کم ہیں اور اس کے تجربات اور محسوسات تعداد اور شدت میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تو اس کا لکھا ہوا انشائیہ یقیناً انشائیہ کے معیار پر پورا نہیں اُترے گا۔

سینٹ بیودے کی نظر میں اختصار سے مراد جامعیت ہے اور یہ خوبی مضمون نگار تب پیدا کر سکتا ہے۔ جب اس کو اپنے موضوع پر عبور حاصل ہو۔

لیکن کہا گیا ہے انشائیہ تقریباً اتنا ہی مختصر ہوگا جتنا مختصر، مختصر افسانہ ہو سکتا ہے۔

انشائیہ کی غیر سالمیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میں کسی قسم کی تنظیم نہیں ہے۔ ظاہری طور پر انشائیہ کسی ایک موضوع پر متعدد و مختلف خیالات کی رنگا رنگ نقش نگاری ہے۔ لیکن اس کے پس منظر میں ایک ایسی تنظیم بھی ہوتی ہے جو انشائیہ کو ایک غیر واضح اور مبہم سی مربوط کیفیت عطا کرتی ہے۔ انشائیہ ایسے ہے کہ جیسے آپ بے تکلف دوستوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں اس ڈھنگ سے کہہ رہے ہیں کہ وہ آپس میں بے ربط ہوتے ہوئے بھی بے تکلفی کے رابطہ سے کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہوتی نظر آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ میں بیان کی سادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مُرے کی نظر میں انشائیہ کی دوسری خصوصیت اس کی بے ربطی ہے جس میں خیالات غیر منظم۔ اور اسلوب غیر منطقی ہوتا ہے۔

انشائیہ بے انتہا شخصی چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انشائیہ نگار اپنی شخصیت یا تاثرات کے بارے میں بات کرتا ہے بلکہ یہ اس کے انکشافِ ذات کا ایک وسیلہ اس طرح بنتا ہے کہ اس کی شخصیت غیر شخصی انداز میں صفحۂ قرطاس پر آتی ہے یعنی مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے اور اس پیش کش میں اس کی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔

انشائیہ مزاحیہ مضمون، مزاحیہ افسانہ یا طنز یہ نہیں ہوتا۔ یہ مضمون، مقالہ، تنقید، ناول یا افسانہ بھی نہیں ہوتا۔

اِنشائیہ کو جو چیز طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں طنز نگار قارئین کو فراز سے مخاطب کرتا ہے اور مزاح نگار نشیب سے، اِنشائیہ نگار ان کو ان کی سطح سے پکارتا ہے اور وہ بھی ایسے کہ انھیں چپکے سے اپنے دل کی گہرائی میں اُتار لیتا ہے۔ اور ان سے اس بے تکلفی سے محو راز و نیاز ہوتا ہے۔ کہ لوگ اس کی باتوں سے محظوظ بھی ہوتے ہیں اور ان پر غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ اِنشائیہ میں مزاح کا عنصر ہوتا ہے۔ بولی ٹھولی، گدگدی، چٹکی، پھبتی، ظرافت کی دھیمی دھیمی آمیزش اِنشائیوں کی جان ہے۔ مضمون میں علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، اخلاقی، معلوماتی، فلسفیانہ، مذہبی نظریات کو پیش کیا جاتا ہے۔ مقالہ میں منطق، دلائل، ٹھوس انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ تنقید میں کسی ادب پارہ کے محاسن اور معائب پر نظر پڑتی ہے۔ ناول اور افسانہ میں ڈھانچہ ہوتا ہے جس میں پلاٹ کی تہیں کھولنی ہوتی ہیں۔

اِنشائیہ نگار کسی اصلاحی نقطہ سے انشائیہ نہیں لکھتا۔ کیونکہ وہ واقعات کا تاثر اور تجربے کے انوکھے پن کو ہی اساس گردانتا ہے۔ وہ اِنشائیہ کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ پیش نظر موضوع کو جذب کر کے سمیٹ سکے اور ایک تازہ شگفتگی کے آئینے سے منعکس کر کے اسے سب کے سامنے لا سکے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اِنشائیہ میں طنز، اور فلسفیانہ بحث مباحثہ خام صورت میں ہوں جو کہ انشائیہ جیسے لطیف اور نازک موضوع کو شخصیت کے حُسن کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس لیے اس میں اِنشائیہ نگار کی شخصیت کے تاثر کو بھی اُبھارتا ہے۔ اور جب تک شخصیت، جذبہ اور فکر کا اچھوتا پن اِنشائیہ نگار کے تجربے اور احساس و خیال کی ندرت میں گھُل مل نہ جائیں، کامیاب انشائیہ کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اگر اِنشائیہ نگار کے پاس نیا زاویۂ نظر ہوگا تو وہ انشائی اسلوب میں شگفتگی پیدا کر سکے گا۔ نئے زاویے سے دیکھنے کی وجہ سے انشائیہ نگار کا مشاہدہ انسانی فطرت کے تجسس سے مل کر نئے نئے انکشافات اور حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس طرح تجربات کے انوکھے پن سے انشائیہ میں وہ تازگی پیدا ہو جاتی ہے جو معمولی سے معمولی موضوع کو بھی شگفتگی عطا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انشائیہ نگار کے پاس تیز قوت مشاہدہ، نیا زاویۂ نظر اور الفاظ کو نئے معنی میں برتنے کا فن ہونا چاہیئے۔ انشائیہ نگار کی نگاہ وسعت اور کشادگی چاہتی ہے اور وہ کسی بھی فکری اُفق کی قید میں رہ کر فکر اور مشاہدہ کی اس تازگی سے محروم رہ جاتی ہے جو اچھے انشائیے کی جان ہے۔

انشائیہ میں گریز کی کیفیت بھی ہوتی ہے اور یہ گریز اس بے ربطی کا نتیجہ ہے جو انشائیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ یعنی آپ جب اسے ایک سرے سے پکڑنا چاہتے ہیں تو دوسرا سرا آپ کی انگلیوں سے پھسل جاتا ہے۔

انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں۔ انشائیہ نگار جس موضوع پر بات کرنا چاہے کھل کر کر سکتا ہے۔ اس میں حیات کا بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور کائنات کا بھی۔ اس میں ماضی کی سیر کی جاتی ہے اور حال کی بھی۔ اِنشائیہ نگار کو چاہیئے کہ مضمون تازہ اور جدید لے جو عوام کی نظروں سے اوجھل ہو۔

اِنشائیہ نگار کے ذہن میں کوئی تصنیف نہیں ہوتی۔ وہ آغاز اور انجام سے بے خبر ہوتا ہے۔

اِنشائیہ نگار انوکھے تجربات نہیں کرتا۔ منطق اور دلیل بازی سے کام نہیں لیتا۔ اس کے پاس بندھے ٹکے اصول نہیں ہوتے۔

اِنشائیہ نگار نہ مبلّغ ہوتا ہے نہ مصلح۔

اِنشائیہ نگار حقیقتوں کا غیر جذباتی تجزیہ کرتا ہے۔ وہ اپنے دل کی بات مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ ذاتی اور نجی ردِ عمل کو انوکھے پن کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اِنشائیہ میں انشائیہ نگار اصل موضوع سے ہٹ کر دیگر تجربات بیان کر سکتا ہے۔

اِنشائیہ اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور یہ عہد اس اِنشائیہ سے ہر لمحہ جھانکتا رہتا ہے۔

ہر اِنشائیہ مختلف ہوتا ہے۔ اِنشائیہ میں زندگی بغیر تصنع اور بناوٹ کے نظر آتی ہے۔

اِنشائیہ کا اسلوب نہایت سلیس، شگفتہ اور نرم و نازک ہوتا ہے۔ بیان میں رنگینی ہوتی ہے۔

اِنشائیہ کسی قسم کی روک ٹوک برداشت نہیں کرتا۔ یہاں بلندی بھی ہوتی ہے، پستی بھی۔ یہاں لغزشیں بھی حسن بن جاتی ہیں۔

اِنشائیہ کا مقصد صرف انبساطی ہوتا ہے۔

اِنشائیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ پانی کے شیریں چشمے کی طرح رواں دواں رہے۔

اِنشائیہ میں خیالات کی گلگشت ہوتی ہے۔

اِنشائیہ میں ہلکی نظمیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اِنشائیہ ہم کو چند لمحات کے لیے دُنیاوی تفکرات سے نجات دلاتا ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے اس کی جمالیاتی موجوں میں کھو کر اپنے غم کو بھلا دیتے ہیں۔ سُرور اور وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اِنشائیہ اُس نرم اور گداز جسم کی طرح ہے جس پر آنکھیں ٹھہرنے سے پہلے پھسلنے لگتی ہیں۔

اِنشائیہ میں ایک ہلکی سی لہک، ایک ہلکی سی لپک، ایک ہلکی سی چہک، ترنم اور گل افشانی ہوتی ہے۔

اِنشائیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جیسے ہی شروع ہوتا ہے۔ محسوس یوں ہونے لگتا ہے کہ کسی نے ستار کے تاروں پر مضراب لگا دی ہو اور پُرکشش لہریں کانوں کے راستے دل اور دماغ پر چھا گئی ہوں۔

غرض اِنشائیہ ایک نہایت ہی منفرد فن ہے۔

اِنشائیہ کے مزاج، موڈ اور ٹیکنیک سے بحث کرنے کے بعد آئیے دیکھیں کہ انشائیہ کی خصوصیات بیان کرنے میں مشرق کے مدبرین نے کیا کیا تعریفیں دی ہیں۔

مولانا صلاح الدین اِنشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں: "انھیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت کچھ اس بچّے کی سی ہو جاتی ہے جو اسکول میں دیر سے پہنچا ہو۔ اور جس نے گھر کا کام بھی نہ کیا ہو۔ لیکن اس کے ہاتھ میں بید پڑنے کی بجائے اُلٹے طبرفی اور قلاقند کے دو بڑے بڑے لفافے تھما دیئے جائیں۔"

مولانا نیاز فتحپوری نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: "اِنشائیہ نگاری دیگر اصنافِ ادب کے مقابلے میں آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ وہ صرف ایک ذہنی اُپج ہے۔ اور مشکل اس لیے کہ ہر ذہنی اُپج اِنشائیہ نہیں بن سکتی۔ اس لیے محض فکر کافی نہیں بلکہ ذکر بھی درکار ہے۔ اور یہ ذکر آسان نہیں۔ اس کی اوّلین شرط عملی نفسیات کی

مہارت ہے۔ اور ادب میں آکر یہ خاص اسلوب اختیار کرلیتی ہے۔ جس میں فلسفہ، تنقید اور ادب کے تمام شعبے (مع طنز، تعریض، مزاح) ایک دوسرے سے گھتے نظر آتے ہیں۔"

ڈاکٹر احتشام حسین نے ان جملہ خصوصیات کو اس طرح بیان کیا ہے " انشائیہ ایک ادب پارہ قرار پائے گا۔ جو زندگی کے مختلف مسائل اور اشیا کے متعلق ایک تخلیقی ذہن کے استعجاب، خوش گوار اور لطیف ردِ عمل، تناسبات اور تناقصات کا ذکر شگفتہ انداز میں پیش کرتا ہے اور منطق یا استدلال کا باقاعدہ التزام کیے بغیر پڑھنے والے کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔"

ڈاکٹر سید محمد حسنین لکھتے ہیں " انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شے پالیتے ہیں۔ ایسی شے جو روزانہ کی سادہ وسپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے جو زندگی کے ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا نے غیر رسمی طریق کار، عدم تکمیل، اختصار، شگفتگی، اسلوب اور انکشافِ ذات کو انشائیہ کے خارجی اور ہیئتی عوامل قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ " ایک اچھے انشائیے کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعہ کے بعد کتاب کو چند لمحوں کے لئے بند کردیں گے اور انشائیہ میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود ہی سوچتے اور محظوظ ہوتے چلے جائیں گے۔"

ڈاکٹر سلام سندیلوی رقمطراز ہیں کہ " اس کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انشائیہ ہم کو چند لمحات کے لیے دنیاوی تفکر سے نجات دیتا ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے اس کی جمالیاتی موجوں میں کھو کر اپنے غم کو بھلا دیتے ہیں۔"

نظیر صدیقی کا کہنا ہے " یہ وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔"

غلام جیلانی اصغر انشائیہ کی تعریف میں کہتے ہیں " انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جو اتنی ہی بے ربط ہوتی ہے جتنی کہ زندگی خود "

جمیل آذر کا کہنا ہے " اپنے اس مخصوص مزاج اور خصوصیت کی بنا پر انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب ہے کیونکہ اس میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا سا تاثر، ناول کا سا فلسفۂ حیات اور ڈرامے کے سے انتظاریہ لمحات اور ان کے پس منظر میں طنز و مزاح کی دھیمی دھیمی مخفی ہوتی ہے۔ ان سب پر مستزاد انکشافِ ذات کا عمل جو خالص انشائیہ کے لیے مختص ہے۔ یہی وہ مقتضیات ہیں جن کا انشائیہ میں ہونا ضروری ہے۔"

رب نواز مائل کہتے ہیں " میرے نزدیک انشائیہ سمندر کی لہروں کو ایک بار کناروں کی طرف پھیلنے اور پھر دوبارہ اپنی طرف سمیٹنے کا عمل ہے۔"

مشتاق قمر کا کہنا ہے " انشائیہ انسان کی مخفی تمناؤں کی دریافت ہے۔"

اگر ڈاکٹر انور سدید کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو ہم یوں کہیں گے " انشائیہ نگار اس انبوہ میں شریک ہے جو پگڈنڈی پر چلتے چلتے کیچڑ میں لتھڑ گیا ہے۔ لیکن زہر خند یا ہنسی کو جنم دینے کی بجائے انشائیہ نگار اس کیچڑ سے اکتساب سرور کر رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو ایسی شگفتہ باتیں بتا رہا ہے جو اسے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھنے، زمین کا لمس سے آشنا ہونے اور کیچڑ کا

ذائقہ چکھنے سے پہلے معلوم نہیں تھی۔"

اِنشائیے کے متعلق دانشوروں میں اختلافات بھی ہیں۔ آئیے ان کا جائزہ بھی لیتے چلیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی نظر میں انشائیے کی خارجی شکل و صورت کسی ایک تکنیکی سانچے کی نہیں۔ انشائیہ ان کے نزدیک ناول، افسانے، ڈرامے، مقالے میں سے کسی ایک فارم کو بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اِنشائیے کی اپنی خارجی شکل کوئی نہیں ہے۔ وہ یہ فارم دوسرے اصناف سے حاصل کرتا ہے۔ انشائیہ میں طنز اور فلسفیانہ مباحث خام صورت میں ہو سکتے ہیں بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی ادب پارہ کی اوپر کی سطح پر سختی اور منطق کی سنجیدگی ہو۔ لیکن نیچے کی سطح میں انشائیہ کی آزاد روی کارفرما ہو۔ اوپر کی سطح پر طنز کی تلخی اور نیچے کی سطح پر ایک غیر سنجیدگی اور بے فکری قائم رہے۔ اس صورت میں اسے انشائیہ تصور کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ انھیں معنوں میں مضامین پطرس میں بعض مضمون اپنی گہری طنز کے باوجود انشائیے معلوم ہوتے ہیں اور شکور حسین یاد کے اِنشائیے بھی اپنے "فلسفیانہ خول" کے باوصف اِنشائیے ہی ہیں۔

نظیر صدیقی اِنشائیوں میں سنجیدہ باتیں غیر سنجیدہ اسلوب میں کہنے کے حق میں ہیں۔

رب نواز مائل یہ بات مانتے ہیں کہ انشائیہ مغرب کی پیداوار ہے۔ لیکن وہ ہر مغربی اِنشائیہ کو حقیقتاً انشائیہ نہیں سمجھتے۔

مشکور حسین یاد کے خیال میں انشائیہ نگار اپنے دل کی بات اس طرح کہنا چاہتا ہے جیسے اس کے سوا اس بات کو کوئی اور نہیں سُن رہا ہے۔

سید شاہ احمد سعید ہمدانی کے مطابق انشائیے کے پیچھے پاسبانِ عقل موجود رہتا ہے اور عمل تخلیق کے تمام عناصر فن پارے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔

رشید نثار کا خیال ہے کہ جب سے خالص انشائیہ لکھا جانے لگا ہے تو اس کی حدیں متعین کی جانے لگی ہیں تو اس صنفِ سخن کے خلاف بھی ایک ردّ عمل ظاہر ہونے لگا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی نظر میں اگر ڈاکٹر وحید قریشی کا مفروضہ تسلیم کر لیا جائے کہ ناول، افسانہ، ڈراما اور مقالہ وغیرہ سبھی انشائیوں کی حدود میں داخل ہو سکتے ہیں تو انشائیہ کی ایک الگ صنفی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ وہ نظیر صدیقی کے اس نظریہ سے بھی متفق نہیں کہ انشائیہ غیر سنجیدہ ہو سکتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے نظریہ سے بھی ان کو اختلاف ہے۔ ان کی نظر میں انشائیہ نگار قاری کو اپنا ہم جلیس بنانے کی سعی کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ اور اقبال آفاقی کچھ مغربی اِنشائیہ نگاروں کی تعریفوں سے اتفاق نہیں کرتے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی نظر میں بیشتر مغربی اِنشائیہ نگار اعلیٰ پایہ کے انشائیہ نگار ہیں۔

اقبال آفاقی اِنشائیہ کا فکری بیک یارڈ پنجاب کے روحانی اور تخلیقی موثرات سے مرتب کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں اُردو انشائیہ غیر ملکی حوالوں اور سوالوں کے باوجود اپنی پہچان کے منطق میں ایسے پر منطبق نہیں ہوتا۔

اختلافات اپنی جگہ، نظریات اپنے اپنے، آئیے ذرا کچھ مغربی اِنشائیوں کے اقتباسات سے لطف لیں جنھیں بقائے دوام کی حیثیت حاصل ہے۔

مونتین کے ایک ایسے 'خوف کی بات' کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو۔

"لوگوں کا یہ کہنا کہ مَیں انسانی فطرت کا ماہر ہوں، صحیح نہیں۔ مَیں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر کس پُراسرار راستے سے ہمارے اندر خوف کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ بہرنوع اس کا محرک کچھ بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ خوف ایک عجیب و غریب کیفیت ہے۔ اتنی عجیب کہ بعض حکما، یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ خوف جس سُرعت سے ہمارے فیصلوں کو بدلتا ہے کوئی دوسرا تیزی کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہ خیال یقیناً صحیح ہے اس لیے کہ مَیں خود اکثر اس جذبے سے مغلوب ہو کر ایک ہیجانی کیفیت کا شکار رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ انتہائی مستقل مزاج افراد بھی جب اس جذبے سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ شدید استعجاب اور ذہنی انتشار سے محفوظ نہیں رہتے۔ مَیں اس سوقیانہ قسم کے خوف اور ہیبت کو نظر انداز کرتا ہوں جس کا محرک کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے۔ جیسے آنجہانی اجداد میں کسی کا کفن پوش حالت میں قبر سے نکلنا یا بھوتوں اور آگ اُگلنے والے اژدہوں کا نمودار ہونا یا کوئی بھیانک خواب . . . "

بیکن اپنے ایک ایسے "مطالعہ" کے بارے میں لکھتا ہے۔

"مطالعہ، مسرت، حُسن اور قابلیت کا ضامن ہے۔ مسرت تو ہمیں نجی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ مگر حُسن مطالعہ کا اندازہ ہمیں گفتگو کے دوران میں ہوتا ہے اور قابلیت کا امتحان کاروباری زندگی کے متعلق فیصلوں میں۔ کیونکہ مشاق عملی طور پر زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان معاملات پر صحیح رائے اہلِ علم ہی دے سکتے ہیں۔ مطالعہ میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرنا محض تساہل ہے اور محض آرائشِ بیان کے لیے اس کا استعمال تکلف اور محض اصولوں کی بنا پر رائے زنی علماء کا مزاج ہے۔ مطالعہ سے ہمارے اندر ایک قسم کی پختگی آتی ہے اور تجربے سے تکمیل ہوتی ہے کیونکہ ہماری فطری صلاحیتیں ایسے خودرو پودوں کی طرح ہیں جن کی کانٹ چھانٹ لازمی ہے اور مطالعہ زیادہ حد تک اس سمت میں کامیابی کی دلیل ہے۔"

رابرٹ لِنڈ "غلطیوں کی شان میں" فرماتے ہیں۔ "میرے خیال میں اکثر لوگوں کے لطف اور مسرت کا ذریعہ دوسروں کی غلطیاں ہیں۔ ہم اکثر اس لیے ہنستے ہیں کہ دوسرا غلطی کرتا ہے۔ اس طرح کسی شخص کی غلطی ہمارے لیے تفریح اور مسرت کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اگر غلطیاں نہ کی جائیں تو ظاہر ہے کہ ہنسی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے خوش و خرّم اور پُرلطف زندگی گزارنے کے لیے غلطیاں ضروری ہیں۔ تاریخ میں اکثر لوگوں کی غلطیاں پڑھنے والے کے لیے مسلسل اور نسل در نسل تفریح اور ہنسی کا ذریعہ بنی رہتی ہیں اور اس کے ساتھ عبرت کا بھی۔ چنانچہ غلطیوں کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس میں سامانِ تفریح بہم پہنچتا ہے اور ہنسی بہرحال زندگی کے لیے لازم اور ضروری ہے۔

غلطیوں کا ایک اور بھی فائدہ ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ مسلّم ہے۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ غلطیوں سے بھی نام ہو جاتا ہے مثلاً دُنیا میں اور ہر ملک میں لاکھوں کروڑوں طالب علم ہیں جنھیں کوئی نہیں جانتا۔ لیکن جوں ہی کوئی لڑکا تاریخِ انگلستان میں ولیم اوّل کی اصلاحات ولیم سوئم کے نام موسوم کرنے کی غلطی کرتا ہے تو اس کا نام اخباروں میں وزیر اعظم اور صدر مملکت کے ساتھ چھپ جاتا ہے اور مفت میں تشہیر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بدنامی اور غلطی کرنے میں بھی نام آوری مضمر ہوتی ہے۔

پس ثابت ہوا کہ غلطیاں نہ صرف انسانی غفلت کا نتیجہ ہیں بلکہ عقلمندی کی بھی دلیل ہیں۔ اس لیے فن کاروں کو غلطیاں کرتے ہوئے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ یوں بھی ہمارے شاعر، ادیب جو غلطیاں کرتے ہیں وہ بہت ہی معمولی قسم کی اور بہت کم

ہوتی ہیں۔ وہ اس سے بڑی اور اس سے بھی زیادہ غلطیاں کر سکتے ہیں۔ کوئی فن کار اس وقت تک شیکسپیئر جیسا عظیم فن کار نہیں بن سکتا جب تک وہ اتنی عظیم غلطی نہ کرے جتنی شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں کی ہیں۔"

جان رسکن "کچھ کتابوں کے بارے میں" لکھتے ہیں۔ "یہاں خراب کتابوں کا تذکرہ میرے لیے غیر ضروری ہے۔ اس لیے مَیں اچھی کتابوں پر ہی گفتگو کروں گا۔ ایک "وقتی اچھی کتاب" ایک ایسے آدمی کی محض بات چیت۔ مفید اور خوشگوار بحث ہے۔ جس سے آپ ویسے گفتگو نہیں کر سکتے۔ مثلاً سفرنامے۔ مزاحیہ کہانیاں۔ مایوس کن یا حیات بخش ناول اور تاریخی واقعات ——— !! یہ تمام چیزیں وقتی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں اور ایک مخصوص حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ہم ان سے خاطر خواہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں تو ہمیں ان کا شکرگزار ہونا چاہیئے اور اپنے اوپر شرمندہ ——— !! اس کے برعکس اگر ان کتابوں کو ہم حقیقی کتابوں کا درجہ دیتے ہیں تو یہ ان کا انتہائی نامناسب استعمال ہوگا۔ کیوں کہ ان کی حیثیت کتابوں کی کم اور اخباروں اور خطوط کی زیادہ ہے۔ ہمارے احباب کے خطوط آج قیمتی اور اہم ہو سکتے ہیں مگر آئندہ کے لیے ان کا محفوظ رکھنا ضروری نہیں۔ ایک اخبار جو ناشتے کے وقت کار آمد ہو، ممکن ہے کہ باقی عام دن بھی بالکل کام نہ آسکے۔ یہ طویل خطوط جو آپ کو کسی جگہ کی پُرانی سڑکوں اور مزاجِ آب و گِل یا وہاں کے دلچسپ کو اُلف سے لطف اندوز کرتے ہیں؛ اگرچہ مجلّہ ہوتے ہیں اور کسی حوالے کے لیے مفید بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن نہ تو ان پر لفظ "کتاب" کا اطلاق جائز ہے اور نہ ہم انھیں واقعتاً پڑھنے کی چیز قرار دے سکتے ہیں۔"

یہ کچھ اقتباسات اس لیے دیئے گئے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مغرب میں ایسے کیسے لکھا جاتا تھا۔

پچیس برس پیچھے چلیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس صنفِ ادب کو انشائے لطیف، خیال پارے، ادبِ لطیف، نثر پارے کہا گیا۔ پھر ایک نام اِنشائیہ تجویز ہوا۔ شروع میں ہر لکھنے والے نے انشائیہ اپنے رنگ میں لکھا۔ پہلے لکھے انشائیوں کو اپنے رنگ میں دیکھا، پرکھا، پھر اس کی چھان بین شروع ہوئی۔ بحث مباحثے ہوئے۔ اس کی حدیں بھی مقرر ہوئیں۔ اختلافات کی رو بھی چلی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اور مطالعہ کی گہرائی نے اس کے خدوخال واضح کیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صنف کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اِنشائیے لکھے جانے لگے۔ بحثیں تیز تر ہوئیں۔ اختلافات بھی بڑھے۔ بہر حال خاموش صنف میں جان پیدا ہوئی۔ انشائیوں کے مجموعے میدانِ ادب میں اُترے۔ قاری نے دلچسپی لینا شروع کی :

اب خالص انشائیوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں :

ڈاکٹر وزیر آغا "فٹ پاتھ" میں لکھتے ہیں۔ . . "سڑک اور فٹ پاتھ جنس کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بلکہ طبعاً اور مزاجاً تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مثلاً سڑک میں مرد کی سی بے قراری اور سیماب پائی ہے۔ اس پر چلتی ہوئی مخلوق، تخلیقی جرثومے کی طرح ایک ازلی اور ابدی بیقراری میں اسیر اور آگے بڑھنے اور ٹکرانے کی شدید آرزو میں سرشار ہے۔ اس کی منزل کون سی ہے؟ اور وہ کون حریف ہے جس سے یہ بالآخر ٹکرائے گی۔ اس بات کی نہ تو اس مخلوق کو خبر ہے اور نہ پروا۔ . . دوسری

طرف فٹ پاتھ، عورت کی طرح چنچل، ملائم اور سُست گام ہے۔ وہ سڑک کے جذباتی نشار کو ایک معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھتا ہے۔ اس کی بے قراری اور شوریدہ سری سے محظوظ ہوتا ہے۔ اور ایک نگاہِ غلط انداز سے اس کی ہر کروٹ کو مسترد کرتا چلا جاتا ہے۔ . . فٹ پاتھ میں ٹھہراؤ ہے، ترغیب ہے، سکون اور آرام ہے۔ یہ سڑک کے جلتے جھلسے مسافروں کے لیے ایک ایر کنڈیشنڈ ریستوران کا درجہ رکھتا ہے۔"

داؤد رہبر "لمحے" میں رقمطراز ہیں: " وقت طویل آسایش کا متحمل نہیں اور لذت کی چوٹی سے نیچے اُترنا ہی پڑتا ہے۔ تو پھر آنے والا وقت بہتر ہے جس میں مسرت ایک پکتا ہوا رسیلا پھل بن کر نظر آتی ہے اور گزرا ہوا عیش گلا سڑا چھلکا بن کر کوچے کی نالی میں جا گرتا ہے۔ مگر مستقبل کے اُمید و بیم تو کبھی کبھی گھلا ڈالتے ہیں اور ماضی کی مصیبت مسکراہٹ کے ساتھ یاد آتی ہے۔ دونوں گوارا ہیں اگر حال خوش گوار ہے۔"

غلام جیلانی اصغر "کچھ جھوٹ کی حمایت میں" دیکھیے کتنا سچ کہہ جاتے ہیں۔ "حقیقت کوئی ایسی منجمد چیز نہیں جس کا صرف ایک ڈائی منشن ہو۔ اگر حقیقت اتنی ہی سطحی ہو تو پھر آدمی صاحبِ حقیقت بن جائے اور جسے چاہے برسرِ عام جھوٹا کہہ دے۔ حقیقت کے کئی روپ ہوتے ہیں اور ہر روپ کے کئی رُخ اور ہر رُخ کے کئی رنگ۔

. . . جھوٹ دراصل سچ کی ابتدائی صورت ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی اصلاح پذیر صورت میں لوگوں کے سامنے آتا ہے تو پھر لوگ باگ اسے قبولیت کی سند عطا کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اسے حسنِ قبول کی سند ہی نہیں دیتے بلکہ اپنے انتخاب کو معقول ثابت کرنے کے لیے اسے دوسروں پر ٹھونستے بھی ہیں۔ لیکن، ایک صدی کے مختصر عرصے میں بھی جھوٹ اپنے واشگاف بلکہ برہنہ روپ میں لوگوں کے سامنے آجاتا ہے اور سرکس کے مسخرے کی طرح اہلِ حق کی سادگی پر خوب مزے لے کر ہنستا ہے۔"

جمیل آذر "نیم پلیٹ" میں فرماتے ہیں: "چند روز سے میرے پڑوس میں ایک صاحب نے اپنے نو تعمیر شدہ مکان کے باہر بڑی فنکاری سے ایک نیم پلیٹ آویزاں کر رکھی ہے۔ پلیٹ میں لکھے ہوئے حروف کو حوادثِ روزگار سے محفوظ کرنے کے لیے اس پر ایک شیشہ چڑھا دیا گیا ہے جیسے کوئی تصویر فریم میں لگا دی گئی ہو اور ڈرامائی ڈائر کے سائن بورڈ پر عمل کرتے ہوئے شیشے کے اندر ایک چھوٹا سا بلب بھی نصب کر دیا گیا ہے۔ رات کو یہ بلب عجیب عشوہ و انداز سے آنکھ مچولی کرتا ہے اور ہر راہ رو سے کچھ اس طور سے نظرِ التفات کی درخواست کرتا ہے کہ آپ صاحبِ خانہ کے نام پڑھنے پر خود کو مجبور اور بے کس پاتے ہیں۔ ان صاحب کے قوتِ اختراع کی داد دینی پڑتی ہے۔"

انور سدید "دسمبر" میں اس مہینے سے اپنی رغبت کا یوں اظہار کرتے ہیں: " دسمبر آتا ہے تو کسی مہمان کی طرح کال بیل کو دبا کر اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتا بلکہ ایک شریر بچے کی طرح پائیں باغ کی دیواریں پھاند کر پہلے گھر کے صحن میں آتا ہے۔ پھر برآمدے میں پلاسٹک کی بنی ہوئی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری بیوی اس کے مخصوص قدموں کی چاپ پہچانتی ہے وہ جلدی سے آتش دان میں آگ جلا کر کرسیوں کو اس کے گرد نصف دائرے میں ڈال دیتی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھ دیتی ہے۔ اس میز پر بھاپ اُگلتی نو بیاہتا لیڈی لپٹن، ٹی کوزی کا گھونگھٹ اوڑھے ہمہ تن اشتیاق بنی منتظر

ہوتی ہے۔ سامنے چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پستہ، بادام اور کشمش آجاتے ہیں۔ ہم سب افراد جو گزشتہ گرمیوں میں فرداً فرداً اکائیوں میں بٹ گئے تھے اب ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں جیسے کٹی ہوئی پھانکیں دوبارہ تربوز میں سما گئی ہوں۔"

کامل القادری "فٹ نوٹ" میں اپنا نام دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے لکھ رہے ہیں۔ "متن متواج دریا کی طرح اُمڈتا، پھیلتا، کنارے کاٹتا، موجیں مارتا گزرتا ہے کہیں کہیں معاون ندیاں بھی اس میں آکر ملتی ہیں۔ اور اس کے سمندِ ناز پر تازیانہ لگاتی ہیں۔ ایسی معاون ندیوں کا نام و پتہ فٹ نوٹ میں درج کرنے کا عام رواج ہے۔ شاید اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ ستمگر کی شہادت تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔ اس کے برعکس فٹ نوٹ وہ موجِ رقصاں ہے جو متن کے متواج دریا سے اچھلتی، کودتی، ناچتی، گاتی کرداڑے توڑتی اپنی چھوٹی سی دنیا آپ بنا لیتی ہے۔"

سلیم آغا قزلباش سب سے چھوٹا انشائیہ نگار ہونے کے باوجود "بلبلہ" میں کتنا بڑا نظر آتا ہے۔ لکھا ہے: "اور آج یہ صورت ہے کہ بعض اوقات صابن کے پانی سے بلبلے بناتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بلبلے بنانے والی نلکی کی نوک میری سوچ کی نوک ہے۔ جس پر باری باری چھوٹے بڑے صدہا بلبلے میرے بیتے ہوئے دنوں کی یادیں بن کر فضا میں بکھرتے جارہے ہیں۔ پھر مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کائنات بھی ایک رنگین بلبلہ ہے جس کے اندر کروڑہا ننھے منے بلبلے ستاروں اور سیاروں کی صورت میں جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ انھیں بلبلوں کے عین درمیان ایک چھوٹا سا وہ بلبلہ بھی ہے جو سورج ایسے ظالم اور جابر حکمران کے گرد گھومتے ہوئے اپنے کانپتے ہوئے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور جس کی سطح پر اُبھری ہوئی سینکڑوں نلکیوں میں سے ایک کے سرے پر میرا حقیر وجود بھی لرز رہا ہے۔"

انجم انصار نے "منگنی کی انگوٹھی" کا نقشہ بیان کیا ہے۔ "منگنی کی انگوٹھی" پہنتے ہی آپ زندگی کے ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ یہ دائرہ منگنی سے پہلے اور منگنی کے بعد والی زندگیوں کے درمیان ایک ایسی نومین لینڈ کا تصور پیش کرتا ہے۔ جس میں تمام تر وابستگی کے باوجود آپ اپنی آزادی، خودمختاری اور رائے کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ تب آپ رعایا ہوتے ہوئے بھی حکمرانی کرتی ہیں۔"

راحت بھٹی "سفید بال" کو جنت کی وادی کا پیغامبر بتاتی ہوئی رقم طراز ہیں: "سفید بالوں میں وقار ہے، سنجیدگی ہے، تمکنت ہے۔ ایک انوکھی آن اور شان ہے۔ تو پھر کیوں نہ ہم بالوں کو کالا کرنے کی بجائے کالے بالوں کو سفید کرنے کا گر سیکھیں کہ ہر فرد، بچہ، جوان، بوڑھا سفید بالوں کا مالک بن جائے۔ اگر یوں ہو جائے تو پھر دنیا میں امن ہی امن ہو۔ صلح ہی صلح ہو۔ نہ کوئی لڑائی نہ جھگڑا۔ تمام حلقے سرد، تمام میزیں جامد، ہونٹوں پر مہریں مگر آنکھوں میں چمک اور دلوں میں روشنی۔ زندہ باد سفیدی۔ پائندہ باد سفید بال۔"

زہرہ جبیں "چوک" میں فرماتی ہیں۔ "ٹھہریئے چوراہا رُک کر چلنے کا نام ہے۔ دم لے کر، سوچ کر، پاؤں بڑھانے کا مقام ہے۔ ملنے کی جگہ ہے۔ بچھڑنے کا بہانہ ہے۔ یہاں کچھ ملتے ہیں بچھڑ جانے کو۔ کچھ بچھڑ جاتے ہیں پھر سے ملنے کو۔ کچھ ملتے ہیں ہمیشہ کے لیے مل جانے کو۔ کچھ پل بھر کے لیے سامنے آتے ہیں اور دائمی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ انمٹ یادیں دے جاتے ہیں۔"

سید ضمیر حسن دہلوی "ہاتھ" اس طرح دکھاتے ہیں۔ "وہ ہاتھ جن کی بدولت انسان ایک چوپائے سے ترقی یافتہ، مخلوق بن گیا۔ وہ ہاتھ جنھوں نے ایلورا، اجنتا اور کھجوراہو کے بُت تراشے۔ اہرامِ مصر بنائے اور شاہ جہاں کے حسین خواب کو

تاج محل کا رُوپ بخشا۔ وہ ہاتھ جو دھرتی کی کوکھ چیر کر سونا نکالتے ہیں۔ ہاتھ مصروفِ کار رہیں تو کائنات سنورتی ہے۔ ہاتھ برسرِ پیکار آئیں تو انسانیت کا لباس تار تار ہوتا ہے۔ اٹھی ہتھیار بنتے ہیں۔ آدمیت لہو روتی ہے۔ اور ہاتھ بے مصرف ہو جائیں، تو شخصیت بوجھل نظر آتی ہے۔ کاندھے جھکنے لگتے ہیں اور آدمی زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے۔"

پریم شنکر سریواستوا جھک مارنا کی تعریف "نہیں کھیل یار و جھک مارنا بھی" میں کرتے ہیں۔ "خیر صاحب۔ گھر جو پہنچے تو بیگم نے اس وقت تو صرف اتنا ہی کہا۔ "ڈرائنگ روم میں جائیے۔ آپ کے مہمان دوست کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔" ذرا سی دیر میں ہمیں ساری کیفیت سمجھ میں آگئی۔ بیگم کی سمجھ داری پر مَن ہی مَن میں انھیں داد دی۔ دوستوں سے معذرت چاہی۔ دل میں ایک بوجھ سا چھپائے ہوئے لیکن ظاہرہ ہنستے کھلکھلاتے ہوئے کھانے پر ان کا ساتھ دیا۔ دوستوں کو "الوداع" اور "شب بخیر" کہنے کے بعد ہم نے جو بیگم کی طرف دیکھا تو ان کا پارہ آسمان پر چڑھا نظر آیا۔ فرمایا: "بازار آپ سامان لینے گئے تھے، یا جھک مارنے۔"

عبدالغنی رہبر "جوتوں کا غبار" میں لکھتے ہیں: "جوتا چاہے کتنا نفیس اور قیمتی کیوں نہ ہو، بہر حال جوتا ہے۔ اسے ہمیشہ سے پامال کیا جاتا ہے۔ اسے کبھی سربلندی نصیب نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کی افادیت میں کوئی کلام نہیں۔ یہ انسان کو سردی، گرمی، برسات، ہر موسم میں تکلیف سے بچاتا ہے۔ یہ انسان کا ہمدم، ہم جلیس، ہمراز اور ہر وقت کا ساتھی ہوتا ہے۔ سفر ہو یا حضر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا یہ صحیح معنوں میں اس کا ہمراز ہوتا ہے جو کبھی راز افشا نہیں کرتا۔"

اختر اورینوی کا کہنا ہے کہ "حالی، شرر، اور حسن نظامی نے اس طرف کافی توجہ کی تھی۔ اگر رفتار ترقی وہی رہتی جو ان بزرگوں نے حاصل کی تھی تو اب تک اس صنف میں اُردو ادب کہاں سے کہاں پہنچ جاتا . . . خطوطِ غالب کو پڑھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ بے مثل مکتوب نگار اگر انشائیے لکھتا تو کیا غضب ڈھاتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ میرامن، سرسید، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، مولانا آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، پریم چند، نیاز فتح پوری، خلیقی دہلوی، راشد الخیری، فلک پیما، رشید احمد صدیقی، پطرس، کنھیالال کپور، کرشن چندر، مہدی افادی، شرف عظیم آبادی وغیرہ کی تحریروں میں انشائیہ کے تیور ہیں۔ انشائیت کے جلوے ہیں۔

انشائیہ کے لغوی معنی جانتے، آغاز اور ارتقا کے بارے میں معلومات فراہم کرتے، اس کے مزاج، موڈ اور تکنیک سے متعارف ہوتے، انشائیہ کی خصوصیات کو سمجھتے اور اس کی تعریف میں دانشوروں کے اختلافات کا تجزیہ کرتے، مغربی اور مشرقی انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کے اقتباسات کا لطف لیتے ہم اس مقام پر پہنچے، جہاں انشائیہ رنگ و آہنگ لے گیا۔ آج انشائیہ تقلیدی منزل سے نکل کر اجتہادی شان کا مالک بن چکا ہے۔ اپنی انفرادیت تسلیم کرا چکا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اُردو ادب کی تمام اصناف میں یہ صنف سب سے مشکل ہے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں ایسے ایک وقت ایک مقام پر ٹھہر گیا تھا۔ اس کی موت کا اعلان بھی ہو گیا تھا۔ لیکن بات وہ ہوئی "یعنی آگے چلیں گے دم لے کر" ایسے پھر زندہ ہو گیا۔ انشائیہ شروع سے ہی خراماں خراماں چلا۔ آج بھی اسی رفتار سے چل رہا ہے۔ اس کا مزاج

مخصوص ہے۔ اس کی چال مخصوص ہے۔ وہ اپنی پہچان کرآتا ہوا منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس میں نہ کبھی تیزی آئی نہ ٹھہراؤ۔ اُسی سے اس نے سبق حاصل کیا۔

سوال ایک یہاں پیدا ہوتا ہے کہ اِنشائیہ نگار پیدا ہوئے، اِنشائیے لکھے گئے۔ مجموعے تک مرتب ہو گئے، لیکن اس صنف میں لکھنے والوں کی تعداد کم کیوں رہی؟ اِنشائیہ کی صنف آسان ہوتی تو بات کچھ اور ہوتی۔ کوئی انشائیہ صحیح معنوں میں اِنشائیہ تبھی کہلائے گا جب وہ اِنشائیہ کے تمام اصولوں پر کھرا اور پُورا اُترے گا۔ اِنشائیہ نگار کی حالت ایک ایسے تیراک کی ہے جو پانی پر تیرتا کبھی ڈبکی لگاتا ہے۔ کبھی آگے نکل جاتا ہے۔ پھر اپنے سانسوں کو قابو میں لا کر پانی کی لہروں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس سُرور کو تیراک کیسے بیان کر سکتا ہے۔ یہاں بات دل سے پیدا ہوتی ہے اور دل پر کس کا قابو۔ بات کا سرا پھسل جاتا ہے مشکل سے ہاتھ آتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں اِنشائیہ نگار کے دل میں چٹکیاں پیدا ہوتی ہیں۔

مختصراً یوں کہ اِنشائیہ نگار کے ذہن سے ایک کونپل پھوٹتی ہے۔ سرسبز، شاداب، نازک، وہی کونپل اپنی نزاکت، اپنی خوبصورتی اپنی دل کشی لیے ایک سدا بہار پودا بن جاتی ہے جس کا نام نامی اسم گرامی انشائیہ ہے۔

کوشش کی گئی ہے کہ اخوتِ احساس، نخوت بیان، سلاستِ زبان اور الفاظ کی نشست و برخاست کے پیچھے سے جھانکتی ایک خندہ زیر لبی کی صورت دکھائی جا سکے جو انشائیے کی دل کشی اور ہر دلعزیزی کا باعث ہو۔

یہ سدا بہار پودا چمنِ اُردو کو مبارک ہو۔

اِنشائیے

فیشن

آج اگر ذکر ہے تو فیشن کا۔ فکر ہے تو فیشن کا۔ آج فیشن کا ذکر کرنا فیشن ہے۔ فیشن کا فکر کرنا فیشن ہے، فیشن سے ملنا فیشن ہے۔ فیشن سے بات کرنا فیشن ہے۔

فیشن واحد چیز ہے جو بہ یک وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ امپورٹ ہوتی ہے۔ ایکسپورٹ ہوتی ہے۔ اسے سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اسے سمجھنے کے لیے فیشن زدہ بننا پڑتا ہے۔ لیکن فیشن زدہ بننا بھی ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ فیشن کل کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ وہ نچلا نہیں بیٹھتا۔ آرام نہیں کرتا نہ آرام کرنے دیتا ہے۔ وہ خراماں خراماں چلتا ہے۔ وہ تیز چلتا ہے۔ وہ بھاگتا ہے۔ یہ اس کی اپنی موج ہے۔ فیشن غم و الم، شکوہ و شکایت، برائی اور چغلی سے بے نیاز ہے۔ وہ مزے اور عیش کی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ عالیشان ہوٹلوں میں ٹھہرتا ہے۔ محلوں میں قیام کرتا ہے۔ انواع و اقسام کے کھانے کھاتا ہے۔ ہر سیکنڈ بدلتا ہے۔ وہ لباس اتنی تیزی سے بدلتا ہے کہ پچھلے لباس کو مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اس کا لباس آنکھوں کو خیرہ کرتا جاتا ہے۔ فیشن جدھر سے گزرتا ہے، اپنی دُنیا آباد کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ مسکراتا، ہنستا، قہقہے لگاتا، چہلیں کرتا، سیٹیاں بجاتا، روایتیوں اور قدیمیوں سے ناتا توڑتا اور جدیدیوں سے رشتہ جوڑتا، گنگناتا، گاتا، ناچتا چلا جاتا ہے۔ وہ جس چیز پر نظر ڈال دیتا ہے، چاہے نظر سیدھی ڈالے یا ٹیڑھی، دونوں آنکھوں سے دیکھے یا ایک آنکھ سے، وہ اس کے چنگل میں پھنس جاتی ہے پھر اس کا عمر بھر نکلنا مشکل ہے۔ اس کی میٹھی مسکان میں ایک کشش ہے۔ اس کی

سحر انگیز آنکھوں میں ایک جادو ہے۔ اس کے گلے میں سوز و گداز ہے۔ اس کی ہر حرکت جان لیوا ہے۔ کتنا ہی کوئی دُنیادار ہو، سوجھ بوجھ کا مالک ہو، چلتا پرزہ ہو، خود کو عقلمند دوسرے کو بے وقوف سمجھتا ہو۔ فیشن سے ملاقات ہوتے ہی اس کے تابع ہو جائے گا بلکہ گرویدہ ہو جائے گا۔ فیشن پہلے دل کو گرفت میں لیتا ہے۔ پھر دماغ قابو میں کرتا ہے۔ فیشن آپ سے کچھ نہیں مانگتا، آپ سے کچھ نہیں لیتا۔ بس آپ اس کا حکم مانتے رہیں گے۔ یہی اس کی کرامات ہے۔ یہی اس کا حُسن ہے۔ یہی اس کی توانائی ہے، یہی اس کی شوخی ہے۔

فیشن کی ابتدا کب ہوئی، کہنا مشکل ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ فیشن کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوّا کو ناراض ہو کر زمین پر دھکیل دیا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ عرش سے فرش پر پٹک دیا۔ دونوں کو اپنے ننگے پن کا احساس ہوا۔ پتّوں سے جسم کو ڈھانپا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فیشن کا سب سے گہرا تعلق لباس سے ہے۔

فیشن کے ارتقا کی داستان اتنی ہی طویل ہے جتنی انسانی زندگی۔ انسان ہر وقت اور ہر عہد میں بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح فیشن بھی بدلتا رہتا ہے۔ البتہ فیشن نے تیز قدم اُٹھائے اور وہ آگے نکل گیا۔ پھر ایسے جھنڈے گاڑے کہ کل کائنات پر تسلط کر لیا۔ اب ہر ملک کا اپنا فیشن ہے۔ ہر علاقہ کا اپنا فیشن ہے۔ ہر گھر کا اپنا فیشن ہے۔ فیشن نے لاکھوں رنگ بدلے۔ اس کا کام ہی رنگ بدلنا ہے، بدلتے رہنا ہے۔

"تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا"

آج فیشن ہر صبح نیا ہے، ہر دوپہر نیا ہے، ہر شام نیا ہے، ہر رات نیا ہے۔

اگر فیشن نے پرانی تہذیب اور پرانی قدروں کا لحاظ رکھا تو دُنیا بھر میں آرٹ چمکا۔ آرٹسٹ پیدا ہوئے سنگ تراشی وجود میں آئی۔ مصوری میں نکھار پیدا ہوا۔ آثار قدیمہ کی حفاظت ہوئی۔ عجائب گھر بنے۔ آرٹ گیلریاں قائم ہوئیں۔ نئے نئے محلات تعمیر ہوئے۔ ریسرچ اسکالر پیدا ہوئے۔ فیشن کے گیت گائے جانے لگے۔ بادشاہوں، مہاراجاؤں، تاجداروں، نوابوں نے اسی کی سرپرستی کی۔ فیشن نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ کلچر پیدا کیا۔ اس کی اپنی روایت تھی، اپنا ایک تمدّن تھا، ایک علامت تھی، فیشن میں عریانی تھی۔ لیکن اس میں آرٹ چھپا تھا۔ اسے آرٹ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، سمجھا جاتا تھا، پرکھا جاتا تھا۔ فیشن کے مینا بازار لگے۔ تزکوں میں اس کا ذکر ہوا۔ فیشن نے نئے نئے زیورات، نئے ملبوسات، بناوٹ اور سجاوٹ کے سامان پیدا کیے۔

تغیر میں زندگی ہے۔ فیشن تغیر لاتا ہے۔ نئی زندگی برتنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ زندگی زندہ رہنے، پنپنے، بڑھنے اور چھا جانے کی خواہش ہے۔ آزادی نے اسے جِلا دی ہے۔ آزادی سے فیشن پنپتا ہے۔ آج کون

ہے جو آزاد ہونا اور رہنا نہیں چاہتا ۔ آزادی ملنے پر انسان خود کو آزاد محسوس کرنے لگ جاتا ہے ۔ فیشن بھی آزاد ہوجاتا ہے ۔ فیشن نے نیا پن اور نیا تیور لانے کے لیے پرانی تہذیب اور پرانی قدروں کو پامال کردیا ۔ وہ ہر مخالفت کو روندتا ، کچلتا ، للکارتا ، دندناتا چلا جارہا ہے ۔ اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی ۔ وہ نہ رکنا جانتا ہے نہ جھکنا ۔

فیشن مغربی ممالک سے شروع ہوا ۔ وقت نے فاصلے کم کردیے ۔ ہوائی جہازوں نے رابطے تیز کردیئے مغربی تہذیب کا اثر مشرق پر پڑا ۔ بلیک منی نے فیشن کو جلا دی ۔ فیشن کے اسکول قائم ہوگئے ۔ سیلون بن گئے ۔ اداروں نے جنم لیا ۔ فیشن پیریڈوں کا اہتمام ہونے لگا ۔ فیشن نے پرانے آرٹ اور کلچر کے معنی بدل دیئے ۔ چرس اور گانجا فیشن کے جزو بن گئے ۔ شراب پینا اور مست رہنا فیشن کی علامت بن گیا ۔

ایک وقت تھا جب کسی لڑکی کے جسم کا کوئی حصہ شاید ہی ننگا نظر آتا ہو ۔ آج حالت دوسری ہے ۔ لباس اور زیبائش کا یہ عالم ہے کہ نمائش مقصود ہے ۔ نئے لباس میں ملبوس ۔ تنگ چولی ، ترشی ہوئی ننگی باہیں ، تابدار رنگ ۔ ہر خط بھرپور ، ہر زاویہ تیکھا ، اونچی اڑی کے بوٹ ۔ دوپٹہ ، سینے اور سر دوپٹے سے بے نیاز ۔ سنوارے ، سجائے بال ۔ آراستہ و پیراستہ جب کوئی لڑکی مسکراتی ، چہکتی ، ہنستی ، قہقہے لگاتی چلتی ہے تو فیشن کے نئے تیور کا احساس شدید تر ہوجاتا ہے ۔ اب تو لڑکوں اور لڑکیوں میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا ہے ۔ لڑکوں نے اپنی تمام تر توجہ صحت بنانے کی بجائے فیشن پر مرکوز کردی ہے ۔ ذرا ٹھٹھکیے :

"بھائی صاحب ، ذرا ایک طرف ہوجائیے ۔"

"یہ بھائی صاحب نہیں ۔ لڑکی ہے ۔"

"تو جناب آپ ہی ایک طرف ہوجائیے ۔"

"میں بھی جناب نہیں ۔ میں اس لڑکی کی ماں ہوں ۔"

کیوپڈ کا تیر چلتا ہے تو کوئی نہ کوئی دل پھینک آوازہ کستا ہے ۔ ادھر چپل حرکت میں آتی ہے ۔ لو ہنگامہ ہوگیا ۔ ٹریفک رک گیا ۔ ایک کہتا ہے یہ لڑکیاں ایسے لباس کیوں پہنتی ہیں ۔ دوسرا کہتا ہے لڑکوں کو اس سے کیا مطلب ۔ تیسرا کہتا ہے آپ دونوں کو کیا پڑی ہے ۔ فیشن ایک کونے میں کھڑا مسکرا رہا ہے ۔

فیشن پر سب سے زیادہ اثر فلموں کا ہے ۔ کپڑوں کے تاجر نئے نئے ڈیزائن کے سلے سلائے کپڑے فلم کمپنیوں کی نذر کرتے ہیں ۔ فیشن کے دلدادہ ان ہی ڈیزائنوں کو حاصل کرنے میں جٹ جاتے ہیں ۔ ایک دوڑ لگ رہی ہے ۔ ملوں کے مالک ہاتھ رنگ رہے ہیں ۔ قیمتی سرمایہ فیشن کی نذر ہو رہا ہے ۔

بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے تاجر کال گرلز رکھتے ہیں ۔ انھیں ہر طرح کی سہولت میسر ہے ۔

ان کی معرفت بڑے مشکل کام نکلتے ہیں۔ کال گرلز رکھنا فیشن میں داخل ہوگیا ہے۔

کیبرے فیشن ہے۔ اسے دیکھنا فیشن ہے۔

فیشن پیریڈوں کا اہتمام دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ ٹکٹیں بلیک میں بھی نہیں ملتیں۔ جس طرح قصاب بکرے کو خریدنے سے پہلے اس کے جسم کا ہر حصّہ ٹٹولتا ہے۔ اسی طرح جج صاحبان پیریڈ میں شامل ہونے والی لڑکیوں کے اعضا کی جانچ کرتے ہیں۔ ہاتھوں کی انگلیوں اور پاؤں کی اُنگلیوں کا قد تک ناپا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کھلے ہال میں شائقین کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ والدین نمایش پر تالیاں بجاتے ہیں، فخر محسوس کرتے ہیں۔

ایک وقت تھا والدین کا کہنا ماننا فیشن تھا۔ اب کہنا نہ ماننا فیشن ہے۔ استاد کی ہر بات کو صحیح سمجھا جاتا تھا۔ اب صحیح بات کو بھی غلط بتانا فیشن ہے۔ پہلے طالب علم ڈرتا تھا۔ اب استاد ڈرتا ہے۔ طالب علم کا ڈرانا فیشن ہے۔ استاد کا ڈرنا فیشن ہے۔

فیشن نے مذاہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ خُدا کی خدائی میں دراڑیں پیدا کر دی ہیں۔ فیشن امیر گھرانوں سے نکلتا ہے۔ اس کا اثر پڑوسیوں پر پڑتا ہے۔ شہر پر پڑتا ہے۔ مُلک پر پڑتا ہے۔ فیشن کے لیے رشوت لی جاتی ہے۔ قرض مانگا جاتا ہے۔ نہیں مِلتا یا مِلنا بند ہو جاتا ہے تو چاقو چلتا ہے۔ فیشن نے چور، اُچکے، جیب کترے، رہزن اور اسمگلر پیدا کر دیے۔ جوا خانے، سیہ خانے تعمیر کر دیئے۔ چکلے اور اڈے بنا دیئے۔

فیشن اپنی راہ پر گامزن ہے۔ آپ چیخیے، چلائیے، فیشن پر اس کا کچھ اثر نہیں۔ کہا نا، وہ قہقہے لگاتا، اُچھلتا، کودتا، اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ اس کی منزل کہاں ہے۔ یہ پتہ تو شاید فیشن کو بھی نہیں۔

پوسٹ کارڈ

ایک مقولہ ہے: "ہر چہ بقیمت کہتر بقامت بہتر"۔ شاید یہ مقولہ پوسٹ کارڈ بنانے والے کی ایجاد ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکخانوں میں پوسٹ کارڈ کی مانگ سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب مانگ زیادہ ہوگی تو اہمیت تو ہوگی ہی۔

پوسٹ کارڈ کا کوئی جامہ نہیں ہوتا۔ شاید یہ مقولہ بھی پوسٹ کارڈ کے لیے ہی کہا گیا ہو:

تن کی عریانی سے بہتر ہے نہیں کوئی لباس
یہ وہ جامہ ہے نہیں جس کا کوئی سیدھا اُلٹا

آپ اسے اُلٹا سیدھا بھی پڑھ سکتے ہیں۔ پوسٹ کارڈ معمولی باتوں میں نہیں پڑتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ قینچی کی ضرورت نہ چاقو کی۔ نہ اس کا جسم ادھیڑنے کی تکلیف اور نہ کسی ردّی کی ٹوکری کی ضرورت کا احساس۔ ادھر ہاتھ میں آیا اُدھر نظریں گھومنے لگیں۔ وہ آپ کو انتظار میں نہیں رکھتا۔ آپ کا دل بھرا سے پڑھنے کو چاہے، جیب میں ڈالیے۔ وہ ہر وقت حاضر ملے گا۔

پوسٹ کارڈ کا ایک الگ مزاج اور لہجہ ہے۔ یہ اس عبارت سے بنتا ہے جو اس پر لکھی جاتی ہے۔ آپ عبارت نہیں لکھیں گے تو بھی پوسٹ کارڈ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ لیکن ہر عبارت کے پیچھے ایک شخصیت کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے وہ عبارت لکھوا لیتا ہے۔ جب پوسٹ کارڈ اپنے گھر سے چلتا ہے تو اس پوری شخصیت

کو اپنے اندر سمیٹ کر اور چھپا کر آگے بڑھتا ہے۔ آپ اس پر ایک سطر لکھیں یا دو سطریں۔ اتنا کچھ لکھ دیں کہ اور کچھ بھی لکھنے کی گنجائش نہ رہے۔ اس کے بعد اس کی حالت بے قابو ہو جاتی ہے۔ وہ آپ کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ وہ آپ کی خدمت کرے اور آپ کا پیغام مکتوب الله تک پہنچا کر آئے۔ آپ کو کشاں کشاں لیٹر بکس کی طرف لے جاتا ہے۔ اُچھل کر آپ کے ہاتھ سے لیٹر بکس میں کود جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسے قید میں رہنا ہے اور ڈاکخانے کی چوٹیں بھی سہنی ہیں۔ لیکن اسے آپ کی خدمت کرنے کا اتنا شوق ہے اور اس جذبہ میں وہ اتنا سرشار رہتا ہے کہ یہ مارا سے یاد ہی نہیں رہتی۔ منزلِ مقصود تک پہنچ کر وہ بیتاب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا کام تب ختم ہو گا جب وہ مکتوب الله کے ہاتھوں میں ہو گا۔

میزائل کا کمپیوٹر اپنے نشانے تک پہنچتا ہے۔ اس طرح پوسٹ کارڈ کا کمپیوٹر وہ اڈریس ہے جو اس کی پیشانی پر لکھا ہوتا ہے۔ یہ کمپیوٹر مکتوب الله کو تلاش کر لیتا ہے۔ میزائل کے کمپیوٹر میں ذرا کسر رہ گئی تو وہ اپنے نشانے پر پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح پوسٹ کارڈ کا اڈریس میں ذرا بھی کمی رہ گئی تو وہ ڈیڈ لیٹر ہاؤس میں چلا جاتا ہے۔ غلطی آپ سے ہوئی، سزا آپ نے بھگتی اور غریب پوسٹ کارڈ کو سزا مفت میں ملی۔ پوسٹ کارڈ عقل سے کام لینا سکھاتا ہے۔ ہوشیار اور تجربہ کار ہونا سکھاتا ہے اور عوض میں کچھ نہیں مانگتا۔ البتہ ایک بات ہے کہ میزائل تو اپنے نشانے کو دھماکے سے اُڑا دیتا ہے اور اگرچہ پوسٹ کارڈ بھی بعض اوقات یہی کام کرتا ہے مگر یہ میزائل کی طرح ہمیشہ ایسا نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو یہ اپنے نشانے کو "زندگی" بھی بخش دیتا ہے اور اکثر و بیشتر اسے جھنجھوڑ کر بیدار بھی کر دیتا ہے۔ سو میزائل کے مقابلے میں پوسٹ کارڈ کہیں زیادہ آزاد، ہمہ جہت اور کارآمد ہے۔

غالب نے فارسی اور اُردو میں شاعری کی۔ نثر بھی لکھی اور بڑے معرکے کی شاعری کی۔ دیوان چھپ گئے۔ لیکن غالب کی پہچان کارڈ نویسی سے ہی ہوئی۔ آج بھی غالب کے کارڈ کا ذکر پہلے ہوتا ہے۔ غالب کا بعد میں۔ اگر کسی شخص کے ہاتھ میں کوئی ایسا پوسٹ کارڈ آ جائے جس پر غالب کا نام لکھا ہوا ہو اور وہ غالب کا ہی لکھا ہو تو اس کے وارے نیارے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے اس کی جانچ ہو گی۔ اب اگر وہ کھرا سونا ہوا تو غالب کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی چمک جائے گا۔ حالانکہ اس شخص نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اسی لیے ریسرچ سکالر لوگوں کے گھروں میں جا کر پرانے بستے نکالتے ہیں۔ چھانتے پھٹکتے ہیں کہ شاید کوئی تحریر مل جائے۔ اب یہ غالب ہی پر کیا موقوف۔ جس کا بھی نام نامی اسم گرامی لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا اس کے ہاتھ کا لکھا پوسٹ کارڈ اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ جی ہاں یہ سب کارنامہ پوسٹ کارڈ کا ہی ہوتا ہے۔ پوسٹ کارڈ نہ ہوتا تو غالب کو کون پوچھتا اور دوسروں کی پہچان کون کرتا۔ لیکن پوسٹ کارڈ کی قسمت دیکھیے کہ لوگ

پوسٹ کارڈ کو بھول جاتے ہیں اور لکھنے والے کو یاد کرتے ہیں۔ پوسٹ کارڈ پر آپ محبت کے گیت لکھیئے۔ حسن و عشق کی داستانیں لکھیے۔ اپنی تعریف لکھیئے۔ دوسروں کے نقص بتائیے۔ بغض و حسد، گلے شکوے، رفاقت، عداوت یہاں تک کہ گالیاں بھی لکھ جائیے۔ چھیڑ خانی کیجیے۔ پوسٹ کارڈ کو آپ سے کوئی شکایت نہیں اور نہ آپ کو پوسٹ کارڈ سے شکایت ہونی چاہیئے۔ پوسٹ کارڈ تو کھلی کتاب ہے۔ وہ کچھ نہیں چھپاتا۔ آپ نے اس پر جو کچھ لکھ دیا وہ اب پبلک پراپرٹی ہے۔ پوسٹ ماسٹر سے لے کر پوسٹ مین تک سب اسے پڑھ سکتے ہیں۔ بند لفافہ تو ایک سربمہر راز ہے جو پہلے سینۂ کائنات میں تھا مگر اب آپ کی مٹھی میں ہے۔ جب کہ پوسٹ کارڈ ایک نعرۂ مستانہ ہے۔ جو پہلے مکتوب نگار کے ہونٹوں پر تھا اور اب خلقِ خدا کے ہونٹوں پر ہے۔ بند لفافہ اپنی ہی ذات میں ایک فرد کی طرح ہے جب کہ پوسٹ کارڈ عوامی چیز ہے۔ بادشاہت سے جمہوریت تک خلقِ خدا نے جو فاصلہ طے کیا ہے وہ دراصل بند لفافے سے کھلے پوسٹ کارڈ تک کا ہی سفر ہے۔

وہ وقت یاد کیجیے جب پوسٹ کارڈوں پر راجے، مہاراجے، نواب، بادشاہ، بیگم، ملکہ اپنا نام، اپنی تصویر، اپنی ریاست کا نام چھپواتے تھے۔ نہ راجے رہے نہ مہاراجے۔ نہ بادشاہ، نہ بیگم، نہ ملکہ۔ نہ ریاستیں لیکن اگر کوئی پوسٹ کارڈ ایسا کسی کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اسے نمائش میں دکھاتا ہے۔ اس کا نام کتابوں میں چھپتا ہے اس کا ذکر ہوتا ہے۔ کارنامہ پوسٹ کارڈ کا ہوتا ہے۔ اسے بھی خوشی بہت ہوتی ہے کہ اس کی کسی نے پہچان کی۔ عزت دیا، مقام دیا۔ اس کی یاد آئی۔ اس کے مہاراجے۔ نواب کی یاد آئی۔

پوسٹ کارڈ بہت مسکین طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے شرارت سوجھ جاتی ہے۔ پھر وہ سفر کرنے کی سوچتا ہے۔ اور میز پر سے کھسک کر دوسرے تھیلے میں چلا جاتا ہے۔ ملکوں ملکوں نہ سہی شہروں شہروں گھومتا ہے۔ مختلف ڈاکخانوں کی سیر کرتا ہے۔ ادھر وہ کھسکا۔ اُدھر انکوائری شروع ہو جاتی ہے۔ شرارت تو پوسٹ کارڈ کی ہوتی ہے۔ پھنس جاتے ہیں ڈاکخانے کے ملازم۔ پوسٹ کارڈ سب دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اسے کوئی سزا نہیں ملتی۔ وہ تو چپ چاپ تماشا دیکھتا ہے۔ یہ اس کی توانائی ہے۔

پوسٹ کارڈ کا ایک جڑواں بھائی بھی ہے۔ دونوں پیار محبت سے رہتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ایک بھائی تو مکتوب الیہ تک پہنچ کر رک جاتا ہے مگر دوسرا مکتوب الیہ سے واپس مکتوب نگار تک سفر کرتا ہے۔ ایک پیغام پہنچاتا ہے دوسرا جواب لاتا ہے۔ کبھی کبھی نہیں بھی لاتا۔ مگر یہ ایک الگ مسئلہ ہے!

انتظار

چھ حروف کے اس لفظ میں کیا کچھ نہیں ہے۔ کرب، الجھن، بے چینی اور اضطراب! مگر اس میں ایک عجیب قسم کا سُرور بھی ہے۔ اس میں ایک ایسا نشہ ہے جو لفظ کی گرفت سے بالا ہے۔

انتظار کی ابتدا کب ہوئی۔ کچھ پتہ نہیں! اس کی رفتار کا بھی آج تک علم نہ ہو سکا۔ خود خداوند کو دُنیا کی مکمل صورت دیکھنے کے لیے پورے سات دن انتظار کرنا پڑا۔ انتظار کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ یہی اس کا حُسن ہے۔ یہی اس کی کرامات اور یہی اس کی توانائی ہے۔

زندگی کی ابتدا بھی انتظار سے ہوتی ہے اور انتہا بھی۔ نئی زندگی کی آمد کا انتظار والدین کرتے ہیں۔ موت کا انتظار ملک الموت کرتا ہے۔ زندگی دینے والا ہو یا زندگی لینے والا، سبھی انتظار کرتے ہیں۔ انتظار ہر ذی ہوش کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا ہے۔ پوری زندگی ایک مسلسل انتظار ہے۔ ساری کائنات کسی کی آمد کی منتظر ہے۔

انتظار خود کوئی کام نہیں کرتا۔ خود کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ انتظار اتفاقی ہے۔ وقت اور حالات کے مطابق گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ بالکل چاند کی طرح! اس کے فیصلے میں کسی کو دخل نہیں۔ اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ بڑے بڑے جابر، بلاکو اور چنگیز جیسے خونخوار اسے قابو میں نہ لا سکے۔ وقت اور موقعہ کا انتظار کرتے رہے۔ انتظار کیا تو کامیاب ہوئے۔

انتظار کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اس کی اپنی موج ہے۔ چاہے تو پلک جھپکنے میں رخصت ہو جائے۔
ورنہ ع صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

انتظار برسوں کی دوستی میں دراڑ پیدا کر سکتا ہے۔ برسوں کے بچھڑے ہوؤں کو ملا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی پوری زندگی چند آرزوؤں کی تکمیل میں گزر جاتی ہے۔ کوئی ساری زندگی جینے کے انتظار میں بسر کر دیتا ہے۔ کوئی موت کے انتظار میں مرتا ہے۔ آنے والا سانس اس بات کا منتظر ہے کہ جانے والا سانس جائے تو وہ اس کی جگہ لے۔ آخری سانس تک انتظار کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

انتظار شعلے کی طرح لپک کر ختم ہو جائے تو آپ مسکرا اٹھتے ہیں۔ انتظار گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگے تو آپ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ آپ اپنی مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں۔ رنج اور غم میں ڈوبے ہوئے اور غصہ میں بھرے آپ کے کانوں کی لویں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ آپ ٹیلیفون کا چونگا بار بار اٹھاتے ہیں۔ سگرٹوں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہیں۔ کمرے میں بےچینی سے گھومتے اور پیر پٹختے ہیں۔ کبھی کرسی سے صوفے پر اور کبھی صوفے سے مونڈھے پر جا بیٹھتے ہیں۔ انتظار کونے میں کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ آپ انتظار کرتے جائیں۔ انتظار بہی تو چاہتا ہے۔

انتظار کچھ لمحوں کا ہو۔ تو اس میں ایک انوکھا کیف ہے۔ ایک عجیب سی سرشاری ہے مگر جب انتظار طویل ہو جائے تو اس کی سرشاری میں کرب کی لذت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ مجھے انتظار کے یہ دونوں روپ پسند ہیں وہ بھی جس میں مبتلا ہو کر دل ہلکی سی چاپ پر بھی دھڑک اٹھتا ہے اور وہ بھی جب دھڑکنا ہی بھول جاتا ہے۔

انتظار کو قابو میں لانے کے لیے بڑے بڑے سائنس داں میدان میں کود پڑے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر ویٹنگ روم بنائے گئے۔ برقی لہریں جاری ہو گئیں۔ جیٹ ہوائی جہاز اڑانیں بھرنے لگے۔ دُنیا کے ہر حصہ سے ٹیلیفون سے رابطہ قائم ہو گیا۔ ہر وہ وسیلہ اختیار کیا گیا۔ جس سے آپ کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ بڑے بڑے مفکروں نے انتظار کے معنی بدلنے کی کوشش کی۔ شاعروں نے انتظار کی مذمت میں گیت لکھے اور پھر موسیقاروں کے سپرد کیے۔ تاکہ ان کا تیا پانچہ کر سکیں۔ مگر انتظار کو کوئی شکست نہ دے سکا۔ انتظار اپنی شکست کا انتظار کرتا ہی رہ گیا۔ مایوس ہو کر لوگوں نے انتظار کے حق میں باتیں شروع کر دیں۔ آپ جہاں بھی جائیں گے ہر جگہ یہی لکھا پائیں گے، کہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کیجیے۔ انتظار میں برکت ہے۔ تعجیل و شتاب کار شیطان ہے۔ سمیوئل بیکٹ کا ڈرامہ "ویٹنگ فور گو ڈوٹ" لفظ انتظار میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ انتظار زندگی کی علامت ہے۔ جو شخص انتظار میں نہیں، وہ مرنے سے پہلے

مر چکا ہے۔

مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو انتظار کے حق میں یہ اعلانات قبول ہیں۔ مجھے جواب کی کوئی جلدی نہیں۔ سوچ کر بتائیے۔ میں انتظار کرتا ہوں۔

سایہ

سایہ ہے تو چار حروف کا ایک لفظ، مگر پوری کائنات اس ایک لفظ میں سمٹی ہوئی ہے۔ کون ہے جسے سایہ کی ضرورت نہیں اور کون ہے جو زیرِ سایہ نہیں۔ روزِ پیدائش سے روزِ اختتام تک اگر کسی چیز کی ضرورت ہر جگہ اور ہر وقت رہتی ہے تو وہ سایہ ہے۔

دنیا میں دو حقیقتیں ہیں۔ روشنی اور تاریکی (خیر و شر) سایہ تاریکی کا ایجنٹ ہے۔ جب تاریکی میں جاتا ہے تو اس میں ضم ہو جاتا ہے۔ اور نظر نہیں آتا۔ روشنی ہو تو نظر آتا ہے۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ روشنی میں کوئی چیز بھی ہو۔ دراصل سایہ شے کے بطن میں ہے۔ شے تاریکی میں رہے تو یہ باہر نہیں آتا۔ روشنی میں آئے تو باہر آجاتا ہے۔ روشنی تاریکی کے بغیر کوئی شناخت نہیں رکھتی۔ تاریکی روشنی کے بغیر عدم ہے۔ ہر شخص جو روشنی کی دنیا میں رہتا ہے اپنی پہچان اپنے سایہ سے کرتا ہے۔ کہاوت ہے کہ اگر پورن ماشی کی رات کسی شخص کو اپنا سایہ نظر نہ آئے تو اس کی موت قریب ہوتی ہے۔ روشنی اپنی مجرد حالت میں موت ہے۔ اسی طرح تاریکی اپنی تنہا ذات میں موت ہے۔ زندگی ان دونوں کی آمیزش کا نام ہے۔ انسان کے وجود کے ساتھ اگر سایہ نہ ہو تو وہ عدم ہے۔ سایہ کے بغیر کون سا کام ہے جو چل سکتا ہے۔

سایہ کا تسلط ہر جگہ ہے۔ زندگی پر موت کا سایہ ہے۔ موت پر زندگی کا سایہ ہے۔ زندگی بھاگ رہی ہے موت کے ڈر سے۔ موت ٹھٹھک گئی ہے۔ زندگی کے ڈر سے۔ زندگی اور موت کی دوڑ چل رہی ہے۔

سایہ ایک کونے میں کھڑا لطف اندوز ہو رہا ہے۔

چور گہری تاریکی میں چوری کرتا ہے۔ اسے سایہ کا ڈر ہے۔ اپنے ہی سایہ کا۔ کسی اور کے سایہ کا بھی۔ وہ روشنی کے تمام نقش مٹا کر اندر قدم رکھتا ہے۔ شر کے لیے تاریکی کی ضرورت ہے۔ تاریکی میں وہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ تاریکی میں ہی وہ گم ہو جاتا ہے۔ تاریکی میں ضم سایہ بھی اس کے ساتھ ہی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے۔

بڑے بڑے انسان، دانشور، مفکر، رہنما تبھی بڑے بن سکے جب ان پر روشنی (خیر) کا سایہ رہا۔ والدین کا سایہ رہا۔ پیر و مرشد کا سایہ رہا۔ علم و تہذیب کا سایہ رہا۔ عقل و دانش کا سایہ رہا۔ سایہ کا ایک لفظ حقیقت میں ایک دعائیہ ہے۔

سایہ نہ مل سکا۔ تو محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس سایہ کی تلاش کرتا ہے۔ عمل کی جانب موڑتا ہے۔ سایہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی تلاش کرے۔ اس کی بھی پہچان ہو۔ مدبر آجائے تو کوٹھیاں، محلات تعمیر کر دیتا ہے۔ محبت کا سایہ والدین کا سایہ بن جاتا ہے۔ سایہ میں شفقت ہے، محبت ہے، سہارا ہے۔

روشنی میں سایہ آپ کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ وہ کبھی اوپر، کبھی نیچے، کبھی دائیں، کبھی بائیں اٹھکیلیاں کرتا ہوا آپ کے ساتھ چلتا ہے۔ کبھی قدموں میں لپٹ جاتا ہے۔ کبھی آپ کے قد سے بڑا ہو کر اپنی طاقت کا ثبوت دیتا ہے۔ اپنی حیثیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کبھی آپ سے آگے نکل جاتا ہے۔ کبھی پیچھے رہ جاتا ہے۔ وہ آپکا رفیق ہے، ہمدم ہے، آپ کا ساتھی ہے۔ آپ ہزار کوشش کریں۔ وہ آپ سے جدا نہیں ہوگا۔ آپ ناچئے، کودئیے، وہ آپ کے ساتھ ناچے گا، کودے گا۔ یہی اس کی شان ہے۔ بچوں کے لیے وہ ایک کھلونا ہے۔ بچے اسے دیکھ کر ناچنے لگ پڑتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ وہی حرکتیں کرتا ہے۔ بچوں، بوڑھوں، بڑوں سب کے ساتھ اس کا سلوک مساوی ہے۔

آپ سڑک پر اکیلے جا رہے ہیں۔ ارد گرد کوئی نہیں۔ سڑک پر چاروں طرف روشنی ہے۔ دل کی باتیں زبان پر آرہی ہیں۔ راز و نیاز کی باتیں۔ عشق و محبت کی گھاتیں۔ قتل و غارت۔ چوری اور ڈکیتی۔ لوٹ کھسوٹ۔ اسمگلنگ کی وہ کہانیاں جو تاریکی میں وقوع پذیر ہوئیں۔ آپ دہرا رہے ہیں۔ سایہ آپکے ساتھ ہے۔ سب کچھ سن رہا ہے۔ سایہ کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہے گا۔ لیکن کیا مجال کہ آپ کا بھید کسی کو بتائے۔ آپ کو بھی نہیں بتائے گا۔ پوچھ دیکھئے وہ آپ کا سچا رفیق، محرم راز ہے۔

میدانِ جنگ میں تیر و تفنگ کا سایہ ہوتا ہے۔ سایہ نہ ہو تو جنگ کیسی اور فتحیابی کیسی۔ لاکھوں خاندان اس ایک سایہ میں پل رہے ہیں۔ پنپ رہے ہیں۔ گردن اٹھا کر چل رہے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ سے کہتے ہیں۔ " تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں "

جنگل میں آپ چلے جارہے ہیں۔ تھک کر چُور اور نڈھال ہو چکے ہیں۔ عرش سے فرش تک سخت گرمی ہے۔ جسم جھلس رہا ہے۔ ملک الموت آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ اچانک ایک دیوار نظر آگئی۔ آپ نے اس کے سایہ میں پناہ لی۔ نئی زندگی ملی۔ جسم میں پھُرتی آگئی۔ آپ سفر پر پھر روانہ ہوئے۔ ملک الموت اپنی ناکامی پر پشیمان ہے۔ سایہ کی خدمت بے لوث ہے۔ آپ پرماتما کا شکر ادا کریں گے۔ سایہ کو بھول جائیں گے۔ لیکن سایہ کو کوئی شکایت نہیں۔ وہ احسان بھی نہیں جتاتا۔ یہی تو اس کی بڑائی اور خوبی ہے۔

درخت کسے سایہ نہیں دیتا۔ انسان ہوں یا حیوان۔ چرند ہوں یا پرند جب تک چاہیں پیڑ کے سایہ میں قیام کریں۔ جب چاہیں چلے جائیں۔ اس کا سلوک سب سے برابر ہے۔ سایہ کسی مذہب، ملت، ملک، قوم، ذات پات کو نہیں جانتا۔ سایہ کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ کوئی ملت نہیں۔ اس کی کوئی قومیت نہیں۔ وہ سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ سایہ کے سایہ میں آرام ہے، سکون ہے۔

روشنی ہو اور سایہ نہ ہو۔ آپ ہزار دروازے بند کریں۔ پردے کھینچ دیں۔ سایہ آپ کے ساتھ چپکے سے داخل ہوگا۔ آپ ہزار کوشش کریں۔ بہلائیں، پھسلائیں، کبھی نہیں جائے گا۔ آپ کوئی کام اس کی موجودگی کے بغیر کر ہی نہیں سکتے۔ وہ آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دے گا۔ آپ اس کے کام میں دخل دے ہی نہیں سکتے۔

سایہ پیدائش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ زندگی بھر ساتھ رہتا ہے۔ جنازے پر بھی وہ آپ کے ساتھ جاتا ہے۔

سایہ کی بہت قسمیں ہیں۔ ان میں ایک زلفوں کا سایہ ہے۔ جتنی گھنی، سیاہ اور لمبی زلفیں ہوں گی۔ اتنا ہی پُرلطف سایہ ہوگا۔ شاعروں کے دماغوں پر زلفوں کا سایہ سیدھا حملہ کرتا ہے۔ اس سایہ کے نیچے دیوان مرتّب ہو جاتے ہیں۔ زلفوں میں کمی آگئی۔ زلف ہی نہ رہی۔ سایہ بھی نہ رہا۔ آپ زلفوں کے سایہ میں بیٹھ کر تو دیکھیے: "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔

یہ انشائیہ ایک چھتری کے سایہ میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ آپ بھی شاید کسی سایہ کے نیچے بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں۔

اللہ میاں کا سایہ قائم رہا تو کسی سایہ کے نیچے پھر ملاقات ہوگی۔ سایہ ہماری باتیں سُننے کے لیے تو موجود ہوگا ہی۔

مُسکرانا

مُسکرانا ایک فطری عمل ہے۔ تہذیب کی علامت ہے۔ مُسکرانا واقعاتی ہے۔ مُسکراہٹ کا کچھ لمحات کے لیے قائم رہنا یا ایک آدھ لمحہ کے بعد مِٹ جانا واقعہ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ مُسکراہٹ کسی ایسے فعل کے سرزد ہونے پر از خود پیدا ہو جاتی ہے جس میں رنگینی، لطافت اور رعنائی ہو۔ جاذبیت ہو۔ ہلکی سی احمقانہ یا ہجویانہ بات پر بھی مسکراہٹ آ دمکتی ہے۔ البتہ کسی کا مذاق اُڑانے کی نیت سے جو مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اس میں بناوٹ اور تصنع کا رنگ ہوتا ہے۔ اِدھر مُسکراہٹ آئی اُدھر چہرے میں جان اور آنکھوں میں طراوت آ گئی۔ ایک نشّہ سا طاری ہو گیا۔ یہ نشّہ لفظوں کی گرفت میں نہیں آتا۔

مسکراہٹ کب عالمِ وجود میں آئی، کن حالات میں اس کا جنم ہوا، اس کا مالک اور خالق کون ہے۔ یہ کس کے تابع ہے۔ دُنیا بھر کی لغات کھنگال ڈالیں۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ سُنا ہے کہ جب مالکِ کل کو اکیلے پن نے تنگ کیا تو ایک خیال آیا کہ اپنی ہی شکل میں مخلوق پیدا کی جائے۔ اس خیال کے آتے ہی لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اب یہ مسئلہ کہ مسکراہٹ کس تاریخ اور کس وقت پیدا ہوئی، ابھی تک مسئلہ ہی بنا ہوا ہے۔ کیونکہ کسی آسمانی صحیفے میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ سُنا یہ بھی ہے کہ جب آدم نے پہلی بار حوّا کو دیکھا تو ان کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ چمک اٹھی۔ پھر جب خلقِ خدا بے تحاشہ بڑھنی شروع ہوئی تو یہ مسکراہٹ آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی۔ سنا تو یہ بھی ہے کہ جب تک دُنیا قائم ہے مُسکراہٹ مسکراہٹیں بکھیرتی رہے گی۔ لیکن یہ بات سُنی سُنائی ہے۔

مُسکراہٹ کا تعلق خوبصورتی سے ہے ۔ خوش سلیقگی سے ہے ۔ اِدھر ایک نہایت خوبصورت ، جوان ، سروقد ، آہو چشم اور نہایت عمدہ لباس میں ملبوس سجی سنوری لڑکی نظر آئی ۔ اُدھر آپ کے لبوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی کسی خوش گلو مغنیّہ نے رسیلے سُر نکالے اور آپ مسکرا دیئے کسی خوبصورت باغ میں لہلہاتی بیلوں پر پھول کھلے یا کلی چٹکی ۔ مُسکراہٹ نے آپ کو آدبوچا ۔ پتّے پتّیوں کی کھڑکھڑاہٹ ، جھرنوں اور آبشاروں کی ترنگ ، کوئل کی کوک ، پرندوں کا چہچہانا آپ کو متبسّم کر دیتا ہے ۔

مسکراہٹ کا واسطہ محبت سے ہے ۔ محبّت شروع ہی مسکراہٹ سے ہوتی ہے ۔ دو نظریں ملیں ۔ دو جوان نظریں دلوں میں اُتریں ۔ گدگدی پیدا ہوئی ۔ بہ یک وقت دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی ۔ پھر کوئی طاقت انھیں الگ نہیں کر سکتی ۔ جہاں الگ کرنے کی کوشش کی گئی ، مسکراہٹ وہاں سے چلی گئی ۔ اور اس کی جگہ آنسوؤں کی بارات نے لے لی ۔

مُسکراہٹ کا گہرا تعلق مصوّری اور سنگ تراشی سے ہے ۔ مُسکراہٹ آپ کے لبوں پر ناچتی رہے گی ۔ مونالیزا کی مسکراہٹ اس کا ثبوت ہے ۔ جب تک کسی پیکر یا مجسمہ کے ہونٹ مسکراہٹ میں نہ بھیگ جائیں اس میں جان پیدا ہی نہیں ہوتی ۔

مسکراہٹ خوش سلیقگی ، تہذیبی روایت مانگتی ہے ۔ جس مکان میں داخل ہوتے ہی ہر چیز قرینے سے رکھی ملے گی ۔ دیواریں صاف ستھری ہوں گی ۔ فرش دُھلے اور چمکتے ہوں گے ۔ بات چیت میں تہذیب اور تمدن کی رو دوڑتی ہوگی ۔ وہاں لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہونا قدرتی ہے ۔ ہر وہ بات جس میں ندرت ہے ، لچک ہے ، نزاکت ، شوخی اور شرارت ہے ۔ کسک ہے ۔ دھڑکن ہے ۔ نئے رنگ ، نئے آہنگ اور نئے ڈھنگ سے کہی گئی ہے ۔ مُسکراہٹ کے بغیر تا دیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔

مُسکراہٹ معصومیت کی دلدادہ ہے ۔ ایک پنشنر پچھلے تین ماہ کی پنشن لینے جاتا ہے ۔ اسے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے ایک سرٹیفیکیٹ دینا ہے ۔ وہ پچھلے مہینوں کا بھی سرٹیفیکیٹ دے دیتا ہے ۔ اس کی اس سادگی پر کلرک مسکراتا ہے ۔ افسر خزانہ مسکراتا ہے ۔ ان کو مسکراتے دیکھ کر پنشنر بھی مُسکراتا ہے ۔ کسی بھی وضع کا کاؤنٹر ہو وہاں نوخیز کلی کی طرح مسکراتی ایک جاذبِ نظر دوشیزہ نظر پڑے گی ۔ یہی وہ مُسکراہٹ ہے جو آپ کو کہیں اور نہیں جانے دے گی ۔ مُسکراہٹ ایک طاقت ہے کششِ ثقل ہے ۔ مسکراہٹ جوڑتی ہے ، بکھراؤ کو ختم کرتی ہے ۔ مسکراہٹ تو متبسّم سورج ہے جس کے گرد تمام ستارے گردش کرنے پر مجبور ہیں ۔ مُسکراہٹ نہ ہو تو سارا عالم ایک چھنکار کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے ۔

حیرت

حیرت دیکھنے، پرکھنے، لانے یا لے جانے کی چیز نہیں۔ یہ صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔ جس طرح محبت ہوتی ہے۔ ہو جاتی ہے۔ کی نہیں جاتی۔ اسی طرح حیرت ہوتی ہے۔ ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی۔ محبت کب وارد ہوگی، کون جانے۔ یہی حال حیرت کا ہے۔ دونوں واقعاتی ہیں۔ دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ محبت ہوجائے پھر جاتی نہیں۔ اور حیرت ہو جائے تو تھوڑی دیر کے لیے تو شاید رک جائے مگر ٹھہرتی نہیں۔ محبت کا دائرہ تنگ ہے لیکن حیرت دائرہ کی قید سے آزاد ہے۔

قدرت کا سب سے بڑا کرشمہ انسان کی تخلیق ہے۔ انسان کا سب سے بڑا کارنامہ قدرت سے ٹکرانا۔ خونخوار جنگلی جانوروں سے پنجہ لینا۔ گہرے سمندروں کی تہہ میں اترنا۔ چاند ستاروں سے باتیں کرنا۔ غاروں اور کھائیوں میں گھس جانا۔ سر بہ فلک چوٹیوں کو سر کرنا ہے۔ وہ یہ سب کام اپنی جان پر کھیل کر کرتا ہے اور خلق خدا کو ورطۂ حیرت میں ڈال راہیِ ملکِ عدم ہو جاتا ہے۔ گویا حیرت میں مبتلا کرنا ہی انسان کی سب سے بڑی آرزو ہے۔

کون ہے جو اپنی حیاتِ مختصر میں کبھی نہ کبھی حیرت کی زد میں نہیں آیا۔ حیرت سب کے لیے ہے۔ کوئی چنگیز، کوئی ہلاکو، کوئی نادر اپنے تابع نہیں کرسکا۔ حیرت کا تعلق ہر ذی ہوش سے یکساں ہے۔ اسے بلانے کی ضرورت نہیں۔ واقعہ شدید غم کا ہو، یا شدید خوشی کا۔ حیرت فوراً آدھمکتی ہے۔ اور سبھی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

حیرت کا حملہ تین قسم کا ہوتا ہے۔ معمولی، سخت، بھرپور۔ پہلی حالت میں آنکھ نصف کھلتی ہے۔ منہ

نِصف کھلتا ہے ۔ ہاتھ اوپر اُٹھ جاتے ہیں۔ کچھ لمحوں کے بعد انسان اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے ۔ دوسری صورت میں آنکھیں پوری طرح کھل جاتی ہیں ۔ مُنہ ایک غار بن جاتا ہے ۔ چہرہ کی جلد میں تناؤ آجاتا ہے ۔ مگر لمحہ بعد انسان اپنی اصلی حالت پر واپس آجاتا ہے ۔ تیسری حالت میں آنکھیں جب ایک بار کھلتی ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب بند نہیں ہوں گی ۔ دہنِ مبارک کھلتا ہے تو لگتا ہے کہ کچھ بھی ہو یہ اسی طرح کھُلا رہے گا ۔ پورا جسم ، ایک لمحہ کی نوک پر آکر ٹھہر جاتا ہے ۔ یہ عارفانہ حیرت ہے ۔ اگر اس حیرت کی زد میں آیا ہوا شخص بڑ کے نیچے سے اٹھنے میں کامیاب نہ ہو تو جسمانی سطح پر نروان حاصل کر لیتا ہے ۔

خدا نے دُنیا کو بنایا ۔ اس پر تقریباً سب کو اتفاق ہے ۔ خدا نے دُنیا کو کس طرح بنایا ۔ اس پر مختلف مذاہب کا اختلاف ہے ۔ خدا کہاں رہتا ہے ۔ اس کا مستقل قیام کہاں ہے ۔ اور عارضی کہاں ۔ اس پر بھی اختلاف ہے ۔ ایک عقیدہ ہے مالکِ کُل نے انسان کو بنایا ۔ شیطان کو بنایا ۔ مگر دونوں نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی ۔ یہ بات خدا کے لیے باعثِ حیرت تھی ۔ انسان نے شیطان سے پناہ مانگی اور شیطان انسان سے ڈرتا رہا ۔ یہ بات خدا کے لیے اور بھی باعثِ حیرت تھی ۔ تو پھر کیا حیرت خدا سے پہلے موجود تھی ۔ غضب ہے کہ آج تک حیرت کی قیام گاہ کا پتہ نہیں چل سکا ۔ ایسی کون سی سواری ہے ۔ جس پر سوار ہو کر وہ پلک جھپکتے ہی پہنچ جاتی ہے ۔ حیرت کے بارے میں خدا نے کسی وضاحت کی آج تک ضرورت محسوس نہیں کی ۔ کسی ہادی سے بھی کچھ نہیں کہلوایا ۔ خدا کو شاید اسی بات سے لطف حاصل ہوتا ہے کہ اس کی پوری خدائی حیرت میں رہے ۔ اور یہ حیرت جب کسی پُر اسرار حسینہ کی طرح ازل اور ابد کے پردوں سے اپنے روئے زیبا کی ذرا سی جھلک دکھاتی ہے تو زمین و آسمان ، چاند ، سورج ، ستارے ، ہوا اور بادل یہ سب ٹھٹھک کر رک جاتے ہیں ، اور رُکے رہتے ہیں تا آنکہ ان کی حیرت زا خاموشی کا سارا عکس انسانی آنکھ میں اُتر آتا ہے ۔

حیرت کی بات ہے نا ؟

خُوش آمدید

محض دو لفظوں پر مشتمل خوش آمدید ایک ایسا روزمرّہ ہے جس نے دُنیائے رنگ و بو، دُنیائے حسن و عشق، دُنیائے شاعری، دُنیائے نقاشی، مصوری، سنگ تراشی کے علاوہ دنیائے سیاست کو اپنے دامن میں لپیٹ رکھا ہے۔ اگر ایک بار کوئی خوش آمدید کے چنگل میں پھنس جائے تو عمر بھر نکلنا مشکل ہے۔

آئیے ہم آپ کو ایک باغیچہ میں لے چلیں۔ موسم بہت سہانا ہے، شام بیت رہی ہے۔ آسمان پر نیلگوں بادل چھائے ہوئے ہیں، ہوا اٹھکیلیاں کر رہی ہے، بھینی بھینی مہک آ رہی ہے، روشیں صاف و شفاف ہیں۔ کیاریاں پھولوں سے لدی ہیں، باغیچہ مسکراتا نظر آ رہا ہے، پودے جھوم رہے ہیں، اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ باغیچہ میں داخل ہوتے ہی کلیوں سے بھری ایک کیاری نظر آتی ہے۔ کلیاں خاموش زبان سے خوش آمدید کہتی ہیں۔ دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ دیکھا آپ سحر زدہ ہو گئے نا! لیجیئے کلیوں سے ملاقات کیجیئے، باتیں کیجیئے۔ لو وہ کلی چٹکی۔ جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں:

آشنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جُھک کے مَیں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

ذرا سامنے دیکھیئے۔ بھونرا اُڑا آ رہا ہے۔ کلی نے اسے بھی خوش آمدید کہی ہے۔ آتے ہی کلی سے لپٹ گیا۔ پھر منڈلانے لگا۔ رس چوسنے لگا۔ اپنی گہری محبت کا اظہار بھیں بھیں سے کرنے لگا۔ کلی بھونرے کو خوش آمدید ہی نہیں کہتی، زندگی بھی دیتی ہے۔ بھونرا کلی کو زندگی دیتا ہے۔ لو بھونرا چلا گیا۔ کلی بھونرے کو پھر خوش آمدید کہے گی۔ بھونرا پھر آئے گا۔ لو، وہ۔

آہی گیا۔ یہ کھیل کلی اور بھونرے کا کب سے چل رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ سراغ لگائیے۔ سوچیے۔ یہ کیا آپ کے سوچتے سوچتے چراغ جل اُٹھے۔ اب پروانہ آیا۔ دیئے کی لَو پر پہنچنے لگا۔ منڈلانے لگا۔ آپ اسے مت روکیے۔ یہ رُکے گا نہیں۔ لَو نے اُسے خوش آمدید کہی ہے۔ پروانے کے پَر جلنے لگے۔ لیکن وہ لَو سے الگ نہیں ہوگا۔ پَر جل گئے۔ اُڑنے کی سکت جاتی رہی۔ پروانہ جل مرا۔ کلی مرجھاگئی۔ لَو بجھ گئی۔ بھونرا ختم ہوا۔ لیکن کلی پھر چٹکے گی۔ دیا پھر لو دے گا۔ بھونرا پھر آئے گا۔ پروانہ پھر آئے گا۔ کلی پھر خوش آمدید کہے گی۔ لَو پھر خوش آمدید کہے گی۔ بھونرا زندگی لینے اور زندگی دینے کے لیے پھر پہنچے گا۔ پروانہ زندگی دینے کے لیے پھر پہنچے گا۔ یہ کھیل کلی کا، لَو کا، بھونرے کا، پروانے کا کب سے چل رہا ہے۔ کوئی نہیں جان سکا۔ اس کی گہرائی میں اُتریئے۔ پتہ یہی لگے گا کہ یہ کھیل کسی کا بھی نہیں صرف خوش آمدید کا ہے۔ یہی وہ کھیل ہے جس نے دُنیائے رنگ وبو، دُنیائے حسن وعشق، دُنیائے شاعری میں انقلاب برپا کیا ہے۔

چلیئے ذرا دُنیائے حسن وعشق کی سیر ہو جائے۔ وہ سامنے دیکھیئے۔ ایک لڑکی دراز قد، آہو چشم، گھنگھرالے گھنے، لمبے سیاہ بال، گلابی اور کتابی چہرہ، بھرا اور گداز جسم۔ جینز پہنے خراماں خراماں چلی آرہی ہے۔ ادھر ہی کہیں سے تین نوجوان، خوبصورت، امیر گھرانوں کے تعلیم یافتہ لڑکے نکل آئے۔ تینوں نے آنکھوں سے باتیں کیں، انگلیوں سے اشارے کیے اور کچھ سوچ کر اور پھر رک کر حسینہ کے پیچھے آہستہ آہستہ آنکھ بچاتے، آنکھ چراتے چل دئیے۔ لڑکی نے مُڑ کر دیکھا۔ ٹھٹھک گئی۔ لڑکے بھی ٹھٹھک گئے۔ لڑکی مسکرائی اور پھر چل پڑی۔ لڑکوں نے حوصلہ افزائی سمجھا۔ پیچھے ہو لیئے۔ لڑکی رُک گئی۔ لڑکے رُک گئے۔ لڑکی نے خوش آمدید کہی۔ لڑکے کھِل اُٹھے۔ لڑکی نے پوچھا۔ "آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔ آپ پڑھے لکھے اور امیر گھرانوں کے لڑکے نظر آتے ہیں۔ پھر یہ کیا مناسب ہے کہ آپ کسی شریف لڑکی کا پیچھا اس طرح کریں جو اخلاق سے بعید ہے۔ قانون کی نظر میں جرم ہے، اور تہذیب سے گرا فعل ہے۔ مَیں پڑھ کر تھک گئی تو ٹہلنے نکل آئی۔" لڑکوں نے تھوڑی خفت محسوس کی، لیکن وہ ان باتوں کے تو عادی تھے۔ ایک نے کہا۔ "بانو، ہم بھی پڑھتے پڑھتے تھک گئے تھے۔ گھومنے نکلے تو آپ نظر آئیں۔ پھول کو اور پھر تازہ گلاب کو دیکھ کر بھنورے پہنچ ہی جاتے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "محترمہ! سچ تو یہ ہے کہ اس باغ کی رونق آپ سے ہے۔" تیسرے نے بات کاٹ کر کہا۔ "اور آپ کی رونق ہم سے ہے۔" لڑکی نے حالات کو بگڑتے دیکھ کر تالی بجائی اور پولیس کے سپاہیوں نے جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ تینوں لڑکوں کو گھیر لیا۔ جی ہاں وہ پولیس انسپکٹر تھی۔ نکلی ہی اس مہم پر تھی۔ خوش آمدید نہ کہتی تو یہ تینوں کیسے قابو میں آتے۔ خوش آمدید کا یہی کمال ہے۔

دُنیائے نقاشی، مصوری، سنگ تراشی کی بات نہ پوچھیے۔ وہاں تو ہر نقشہ، ہر دیوار، ہر تصویر، خوش آمدید۔ خوش آمدید پکارتی نظر آئے گی۔ مجسمہ دیکھ کر آپ خود مجسمہ بن جائیں گے۔ ایک دفعہ اس دُنیا میں داخل ہو گئے پھر نکلنا مشکل۔ اسے پھر کبھی دیکھیں گے۔ وہ سامنے بہت بڑا ہوٹل ہے۔ آئیے ادھر گھوم آئیں۔

وہ کار سے بہت موٹا سیٹھ اُترا۔ سیدھا کاؤنٹر پر گیا۔ وہاں نوخیز مُسکراتی لڑکی نظر آئی۔ سیٹھ نے قیامت دیکھی اور سب کچھ بھول گیا۔ لڑکی نے لب ہلائے مُسکراہٹ پیدا کی اور سیٹھ کو خوش آمدید کہی۔ سیٹھ کی نظریں کبھی گھنگھرالی لٹوں میں اُلجھیں تو کبھی لڑکی کی گہری نیلی جھیل جیسی آنکھوں میں اُتر گئیں۔ پھر سینے کے اُبھارے ہوتی ہوئیں مخروطی انگلیوں پر رنگین پالش میں دھنس گئیں۔ ایک جادو تھا اور سیٹھ سحر زدہ کھڑا تھا۔ لڑکی نے پھر خوش آمدید کہی۔ تب سیٹھ کو ہوش آیا۔ رات کو پھر وہی لڑکی سیٹھ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سیٹھ کو لگا جنت سے حُور اتر آئی ہے۔ سیٹھ نے خوش آمدید کہی۔ صبح سیٹھ جاگا۔ جیبیں خالی۔ بکس جواہرات سے بھرا تھا وہ خالی ملا۔ بدنامی کا ڈر۔ پولیس کا خوف۔ پھر ہوٹل والوں سے واسطہ۔ وہ سیٹھ جو بڑے بڑے عیاروں کی تجوریاں خالی کر کے ہی گھر واپس جاتا تھا خوش آمدید کے ہاتھوں لٹ کر جا رہا تھا۔

خوش آمدید کی کہانی طویل ہے۔ آج تک کسی نے اس پر ریسرچ نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ جو اس کے چنگل میں پھنس گیا وہ پھر نکل نہیں سکا۔ اتنا خطرہ کون مول لے۔ واللہ کیا خوب ہے یہ دو لفظوں کا روزمرّہ۔ خوش آمدید۔

گالی

گالی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ یہ سکھانی نہیں پڑتی ۔ بچہ گھر میں ہو یا سکول میں ہو، اسے پہلا سبق یہ دیا جاتا ہے کہ زبان سے کبھی گالی نہ نکالے ۔ وہی بچہ جب گھر میں والد کو، سکول میں استاد کو، محلّے میں لڑتے ہوئے لوگوں کو گالیاں دیتے سُنتا ہے تو اس کا نازک دماغ اصل سبق بھول جاتا ہے کیونکہ گالیاں دیتے وقت چہرے کے رنگ بدلتے رہتے ہیں اور ان میں قدرے کشش ہوتی ہے، اس لیے بچّے کے ذہن پر وہ کندہ ہو جاتی ہیں، اور یہ سبق وہ عمر بھر نہیں بھولتا ۔

گالی کی ابتدا کا پتہ نہیں چل سکا ۔ لغات دیکھ لیں ۔ دانشوروں سے مل لیے ۔ دُنیا بھر کا ادب کھنگال ڈالا ۔ لگتا ہے جب اللہ میاں نے آدم کو اپنے گھر سے نکالا تو جھڑ کا بھی ہو گا ۔ جب آدم اور حوّا اکیلے رہ گئے تو ہو سکتا ہے کہ ان کا کسی بات پر جھگڑا ہوا ہو ۔ آدم نے اپنی فضیلت کا رُعب جمانے کے لیے حوّا کو جھڑک دیا ہو ۔ جو بعد میں دھمکی کی صورت اختیار کر گیا ہو ۔ اور ارتقا میں گالی بن گیا ہو ۔ ممکن ہے حوّا نے بھی قدرے بے تکلّفی سے کام لیا ہو ۔ کیونکہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مرد گالی دیتا ہے ۔ عورت گالی دیتی ہے ۔ بچّہ گالی دیتا ہے جو غالباً اس نے اپنے والدین سے مفت میں حاصل کی ہوں گی اور مفت کی چیز کسے پیاری نہیں ہوتی ۔

گالیوں کی سطح عالمی ہے ۔ دُنیا بھر کی جتنی زبانیں ہیں سب میں گالی دی جا سکتی ہے اور دی بھی جاتی ہے ۔ ہر مُلک کی اپنی گالی ہے ۔

بادشاہوں کے بارے میں فارسی کا ایک شعر ہے :

گاہے بہ سلامے برنجند

گاہے بہ دشنامے خلعت دہند

ہر بادشاہ کے دربار میں جہاں علماء اور فضلاء اپنی علمیت اور فضیلت سے بادشاہ کو خوش کرتے تھے وہاں مسخر نواز، بھاٹ اپنی حرکتوں اور لطیفوں سے بادشاہ کو محظوظ کرتے تھے۔ جب وہ دیکھتے تھے کہ بادشاہ کی خوشی انتہا پر ہے تو بات چیت میں نیا رنگ اور آہنگ لانے کے لیے اور موقع و محل دیکھ کر ایک رسیلی سی گالی بھی نکال دیتے تھے۔ بادشاہ جبھن کو جو اس گالی میں چھپی ہوتی تھی، محسوس کر لیتا تھا لیکن بے حد خوش ہونے کی وجہ سے انعام و اکرام دیتا تھا۔ ہوسکتا ہے علماء نے اپنی علمیت سے اور مسخر نوازوں سے مل کر گالیوں کی قسمیں ایجاد کی ہوں۔ انھیں استعمال کرنے کے طریقے اور سلیقے پیدا کیے ہوں۔

گالیوں کی بہت قسمیں ہیں۔ یہ بھی آپ کو کسی لغت میں نہیں ملیں گی۔ یہ علم سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ غبی سے غبی شخص کو یہ حفظ ہو جاتی ہیں۔ گالیاں نازک، لطیف، نرم بھی ہوتی ہیں۔ اور گالیاں وزنی اور موٹی بھی ہوتی ہیں۔

گالی جب آنا چاہتی ہے۔ بلا روک ٹوک آجاتی ہے۔ جب جانا چاہتی ہے بلا کسی سے پوچھے چلی جاتی ہے۔ جتنی دیر ٹھہرنا چاہے ٹھہر جاتی ہے۔ چاہے معمولی لڑائی کرا دے۔ چاہے سر پھڑوا دے۔ عدالت میں مقدمات دائر کرا دے۔ چاہے وہیں صلح صفائی کرا دے۔ یہ گالی کی اپنی موج ہے۔ معاملہ سنگین ہوا اور گالی کی نیت جائے واردات پر پہنچنے کی نہ ہو تو جسے غصہ آتا ہے وہ گالی دیتا ہی نہیں۔ گولی مار کر یا چھرا گھونپ کر معاملہ کا ڈراپ سین کر دیتا ہے۔ عام طور پر گالی کی تشریف آوری اس وقت ہوتی ہے جب کسی کو غصہ چڑھتا ہے۔ پھر وہ شخص فریق مخالف کو گالی دیتا ہے۔ فریق مخالف نے اگر کبیر کا کہا سُن رکھا ہے یا پڑھ رکھا ہے کہ :

آوت گالی ایک ہے، الٹت ہوئے انیک

کہہ کبیر نہ اُلٹیے وہی ایک کی ایک

تب تو مخالف خموش رہے گا اور معاملہ وہاں ہی نپٹ جائے گا۔ اگر گالی دینے والے کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور گالی کا سلسلہ جاری رہا تو گالیاں کھانے والے کا بھی خون کھول اُٹھتا ہے پھر یہ سلسلہ ایسا شروع ہوتا ہے کہ بند ہونے میں نہیں آتا۔ بہت بار کوئی بھلا مانس صلح صفائی کرانے کی نیت سے دونوں کو منع کرتا ہے عوضانہ میں گالیاں کھاتا ہے۔ بعض دفعہ وہ بھی میدان میں ڈٹ جاتا ہے۔ تب گالیوں کی قسمیں ایجاد ہوتی ہیں۔ معاملہ تھانے پہنچتا ہے۔ اگر آپ کا دل دھواں دھار گالیاں سننے کو چاہے تو ان کے ساتھ ہی چلے جائیے۔ وہاں کام کی بات سے پہلے بھی کام ہوتا ہے گالیاں دینا آسان کام نہیں۔ ہمت، طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مدِ مقابل کوئی مضبوط انسان ہوتا

ہے۔تو انسان گالیاں دینے کی بجائے خود کو ہی گالیاں دے کر اپنا غبار نکال لیتا ہے۔

گالیاں دینے کے لیے نہ عمر کی قید ہے، نہ وقت کی اور نہ موسم کی۔آپ جب چاہیں، جہاں چاہیں، جس طرح چاہیں، جدھر چاہیں گالیوں کی مشق کر سکتے ہیں۔ایک آدھ گالی نکال کر من کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔صبح سے شام تک اور اگلی صبح تک مسلسل گالیاں نکال سکتے ہیں بس شرط یہ ہے کہ جگہ شارع عام نہ ہو اور آپ کی گالیوں کی آواز پڑوسی کے کان تک نہ پہنچے۔آپ تو گالیاں کسی اور کو دے رہے ہوں گے اور وہ گالیاں آپ کو دے گا۔ظاہر ہے کہ جب آپ اپنے پڑوسی کو گالی نہیں دے رہے تو اس کی گالی بھی آپ کیوں سنیں گے اور پھر صورت یہ بھی ہے کہ نہ آپ اسے گالی دینا چاہتے ہیں اور نہ وہ آپ کو گالی دینا چاہتا ہے۔دوسرے معنوں میں گالی دینے کے لیے تہذیب، عقل، شرافت کا دامن تھامے رکھنا پڑتا ہے۔

آپ نے گاڑی بانوں کو اور کسانوں کو کھیت میں ہل چلاتے دیکھا ہے۔وہ جانور پر کوڑا بھی برساتے جاتے ہیں اور گالیاں بھی دیتے رہتے ہیں۔اللہ میاں نے انسانوں کے لیے ہی گالیاں محدود کر دی ہیں اور جانوروں کو بے نیاز رکھا ہے۔انھیں کوڑے کی چوٹ تو سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ تیز چلنے لگتے ہیں لیکن گالیوں سے ان کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔اگر اللہ انھیں گالی سمجھنے کی عقل دے دیتا تو انسان کی کیا مجال جانور کو گالی دے دیتا۔کبھی کبھار جب کوئی مخالف کسی گاڑی کے پاس سے گزر رہا ہوتا ہے تو وہ جانوروں کو مخاطب کر کے اپنے مخالف کو خوب گالیاں سناتا ہے۔چونکہ اس میں مخالف کا نام نہیں ہوتا اس لیے وہ گالیوں کو سنا ان سنا کر کے چلا جاتا ہے۔

دوسرے معنوں میں گالی ایک حربہ ہے جسے وقت پر مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔

بہت بچوں کا تکیہ کلام گالی ہو جاتا ہے۔عمر کے ساتھ تکیہ کلام میں پختگی آجاتی ہے۔وہ بچہ جب سمجھدار ہو جاتا ہے تو گالی سے اجتناب کرتا ہے۔اور جب وہ لوگوں کو گالی کے نقصانات پر تقریر کر رہا ہوتا ہے تو اس کا تکیہ کلام کبھی کبھار دماغ کی سطح پر اُبھر آتا ہے۔اور انجانے میں زبان سے نکل جاتا ہے۔محفل مسکراتی ہے۔ہنستی ہے۔قہقہے لگاتی ہے اور مقرر احساسِ ندامت میں گڑ جاتا ہے۔

ذہین اور خوددار لوگ کبھی گالی گلوچ سے کام نہیں لیتے۔لیکن جب وہ بے تکلف دوستوں میں بیٹھ جاتے ہیں تو خوب کھلتے ہیں اور ایک دوسرے کو گالی سے مخاطب کرتے ہیں۔بیاہ شادیوں میں تو عورتیں مقفیٰ اور مسجع گالیاں نکالتی ہیں۔فحش باتیں تک کہہ جاتی ہیں۔ایسے خوشی کے موقعوں پر کوئی بُرا نہیں مانتا۔گالیاں اپنا تسلط دیکھ کر خوب خوش ہوتی ہیں۔

بعض گالیاں بہت پُر لطف، شوخ، اور دلچسپ ہوتی ہیں۔بعض گالیوں میں ترنم اور رقص چھپا ہوتا ہے بعض گالیوں میں شعلہ کی لپک ہوتی ہے۔انھیں سُن کر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔اللہ والوں کو دیکھیے کسی کو

پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ پتھر مارتے ہیں۔ ان کے پاس پہنچنے سے پہلے نہایت غلیظ گالیاں بھی سُننی پڑتی ہیں۔

ادب میں ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنا اور گالی دینا رواج بن گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے اسی لیے ایک بار کہا تھا: "مجھے بڑے شوق سے گالیاں دیجیے۔ اس لیے کہ یہ غیر فطری چیز نہیں۔ لیکن ذرا سلیقے سے دیجیے۔ نہ آپ کا مُنہ بدمزہ ہو اور نہ میرے ذوق کو صدمہ پہنچے۔"

پنجابی گالیاں سب گالیوں سے ممتاز ہیں۔ اس میدان میں جو تخلیقی سرگرمیاں پنجابیوں نے دکھائی ہیں اور اس میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ کون نہیں جانتا۔ میر تقی میر کا کہنا ہے کہ اب تو اہلِ زبان کم پنجابی گالیوں سے لطف اندوز ہونے لگے ہیں۔

گالی محبت اور نفرت دونوں سے پیدا ہوتی ہے۔ محبّت کی گالی میں دعا، تعریف ہوتی ہے، خلوص ہوتا ہے ہلکی سرزنش ہوتی ہے۔ نفرت میں بددعا اور مذمت ہوتی ہے۔

غالب تو گالی کھانے کو ایک مستحسن فعل قرار دیتے ہیں۔ یہ شعر انھیں کا تو ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہُوا

گالی کس نے ایجاد کی۔ کب کی۔ کیوں کی۔ آج یہ کس مقام پر پہنچ چکی ہے۔ آئندہ ترقی کے امکانات کیا ہیں۔ عالمی سطح پر ان کے تال میل سے کیا فائدے یا نقصانات ہو سکتے ہیں، یہ ریسرچ کا موضوع ہے اور ریسرچ ہمارا موضوع نہیں۔ اس لیے یونیورسٹیوں کو اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ گالیوں کے مقابلے کرانے چاہئیں۔ بات سے بات نکالنی چاہئے۔ ضروری نہیں کہ بیچارے جانوروں کی ہی کھالیں اُتاری جائیں۔ گالیوں کی بھی کھال اُتاری جا سکتی ہے۔

مَیں فی الحال گالیوں کی لغت تیّار کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ جتنی گالیاں آپ جانتے ہیں اور بہ آسانی مجھے ارسال کر سکتے ہیں۔ ارسال فرمائیے۔ لغت میں گالیوں کا ذکر تو ہو گا ہی آپ کا ذکرِ خیر بھی ہو گا۔ گالیوں کو زندگی ملے گی۔ آپ کا نام ہو گا، میرا کام ہو گا۔

تنہائی

تنہائی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انسان دُنیا میں تنہا آتا ہے اور تنہا ہی دُنیا سے جاتا ہے۔ یعنی زندگی تنہائی سے شروع ہوتی ہے اور تنہائی پر ختم ہوتی ہے۔ پنگوڑے میں وہ تنہا لیٹتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو تنہا چیختا ہے۔ جب ضعیف ہو جاتا ہے تو اس کے پاس کوئی پھٹکتا تک نہیں۔ تنہا ہی رہ جاتا ہے۔

خدا ایک ہے، لاشریک ہے، تنہا ہے۔ نہ جانے کب سے اور نہ جانے کب تک رہے گا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ کسی آسمانی صحیفے میں اس کا ذکر نہیں۔ تنہا وہ اتنی بڑی کائنات پر کیسے حکمرانی کر رہا ہے یہ بات نہ سمجھ میں کبھی آئی نہ آسکتی ہے۔ فی الحال ہم تنہا خدا کو تنہا خدا ہی کے بھروسے پر چھوڑ کر اس کی خدائی میں تنہائی کی بات سوچتے ہیں۔

ایک وہ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ ہر وقت اس کی یاد میں مستغرق رہتے ہیں۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ تن تنہا پہاڑوں کی کندراؤں میں، شہروں اور بستیوں سے دُور، خاموش جنگلوں میں کسی کونے میں چھپے دُبکے پڑے رہتے ہیں۔ وہ کسی سے نہیں ملتے اور نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان سے ملے۔ ان کو شاید تنہائی اس لیے پسند ہے کیونکہ ان کا خدا تنہا رہتا ہے اور وہ خدا کے خاص بندے ہیں۔ ان کا ساتھ صرف ان کی تنہائی دیتی ہے۔ ان کا اور تنہائی کا ایک رشتہ ہے۔ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ دُنیا اور مافیہا سے بے نیاز پوری زندگی تن تنہا گزار دیتے ہیں۔ دوزخ کا خوف، جنّت کے مزے، ان کے دماغ میں اس حد تک بس چکے ہوتے ہیں کہ وہ عمل کی زندگی سے اس لیے گریز کرتے ہیں کہ مبادا کوئی غلط قدم اُٹھ جائے اور انھیں دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ اور جنّت ارضی نہ مل سکے یا وہاں دیر سے جانا

نصیب ہو۔

ایک وہ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہی نہیں۔ اس کی یاد میں رہنا تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اس کی حکم عدولی فریضہ سمجھتے ہیں۔ وہ شہروں اور بستیوں میں رہتے ہیں۔ ہر ایک سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی انھیں تنہا مل جائے تو وہ اس کا مال ہتھیالیں۔ گھروں کے تالے وہ تنہائی میں توڑتے ہیں۔ قتل و غارت تنہائی میں کرتے ہیں۔ پکڑے جاتے ہیں تو سزا بھی تنہا بھگتتے ہیں۔ ان کی زندگی پر عمل ہے۔ راستہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ بات دوسری ہے۔ رہتے وہ بھی تنہا ہیں۔

تنہائی کو کسی سے غرض نہیں۔ جو اس کو اپناتا ہے وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ عمر بھر ساتھ دیتی ہے۔ عوض میں کچھ نہیں مانگتی۔ اللہ والوں کے ساتھ وہ کونے میں دُبکی پڑی رہتی ہے۔ چوروں، ڈاکوؤں کے ساتھ رہتی ہے لیکن دور سے ہی نظارہ دیکھتی ہے، لطف لیتی ہے۔ اس کا سلوک سب سے یکساں ہے۔ بلالحاظ ملک و قوم، مذہب و ملت، رنگ و نسل۔

شاعروں کو شعر تنہائی میں سوجھتے ہیں۔ تنہائی ہی شاعر کو شاعر بناتی ہے۔ دیوان تک لکھوا دیتی ہے۔ جتنی لائبریریاں دُنیا میں قائم ہیں سب تنہائی کی دین ہیں۔ یہ تنہائی ہی کی مہربانی اور کرم ہے۔ تنہائی نہ ہوتی تو شاعر پیدا ہی نہیں ہوتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لائبریریوں میں تنہا اور خاموش بیٹھنا پڑتا ہے۔ ایک لفظ بولنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ طرح طرح کے خیالات اس تنہائی میں ہی سوجھتے ہیں۔ تنہائی نثر لکھوا دیتی ہے۔ نظم لکھوا دیتی ہے۔ شاعر، ادیب، مورخ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کارنامہ ان کا ہے۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ سارا کھیل تنہائی کا ہے۔ اس لیے بڑے بڑے شعرا نے تنہائی کو رحمت بتایا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن نے اپنے ایک ہی لافانی شعر سے خود کو ہی نہیں بلکہ تنہائی کو بھی لازوال بنا دیا ہے۔ شعر یوں ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نظیری فرماتے ہیں:

تنہائی و خلوت طلبد عشق نظیری
ایں خیل و خدام را بہ امر حشمے بخش

غالب پیچھے کیوں رہتے۔ وہ بھی جانے سے پہلے فرما گئے تھے:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

دیکھا تنہائی کا کمال ۔ کاش ان شعراء کو تنہائی کا پورا عالم مل جاتا ۔ تنہائی کے وارے نیارے ہو جاتے ۔

تنہائی کے بطون میں قربت چھپی ہوتی ہے ۔ کسی عاشق کو دیکھیے ، تنہا ہوگا ۔ تنہا رہنا چاہے گا ۔ وہ بند کمرے میں تنہا اپنے معشوق سے باتیں کر رہا ہوگا ۔ وعدے وعید کرتا دکھائی دے گا ۔ زندگی کے شیش محل تیار کر رہا ہوگا ۔ نہایت خوش و خرم زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھ رہا ہوگا ۔ تبھی تو غالب نے فرمایا تھا :

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اب آپ سے کیا پردہ ۔ یہ غالب بہت بڑا عاشق ہو گزرا ہے ۔ شراب بھی پیتا تھا ۔ عشق تنہا کرتا تھا ۔ شراب بھی تنہا پیتا تھا ۔

مصوروں ، سنگ تراشوں کی دُنیا میں نکل جائیے ۔ تنہا بیٹھے ہیں ۔ برش مصور کے دائیں ہاتھ میں ہے ۔ رنگوں کا تھال بائیں ہاتھ میں ہے ۔ سامنے ایک کینوس ہے ۔ بس مصوروں کی اتنی ہی کائنات ہے ۔ ادھر کسی نے جھنجھوڑا ۔ یا تو برش ہی ہاتھ سے گر گیا یا رنگ ہی غلط جگہ بھر دیا گیا ۔ دماغ کی ایک ایک کل پتھر میں سے تصویر ڈھونڈنے میں لگی ہوئی ہے ۔ کسی نے تنہائی میں خلل ڈالا ، ہتھوڑی غلط چل گئی ۔ سب کچھ ختم ہوا ۔ یہ تنہائی کا کمال ہے کہ بڑے بڑے عجائب گھر ، بڑی بڑی آرٹ گیلریاں بن گئیں ۔ بڑے بڑے محلوں کے نقشے مرتب ہو گئے ۔ تاج محل بن گئے ۔

خواب تنہائی میں آتے ہیں ۔ خوابوں کی تعبیریں تنہائی سے وابستہ ہوتی ہیں ۔ تنہائی میں ہی ان کی تکمیل ہوتی ہے ۔ سُراغ رسانوں کو آپ نے دیکھا ہی ہے ۔ لاکھوں میں موجود ہوں گے لیکن تن تنہا ۔ آپ کو پتہ چل گیا ۔ پھر سُراغ رسانی کیسی ۔ تنہا غاروں میں گھُس جائیں گے ۔ قاتلوں کے اڈوں پر پہنچ جائیں گے ۔ خطرناک جگہوں میں داخل ہو جائیں گے ۔ تنہا موت کا مقابلہ کریں گے ۔ سراغ رسانی جیسا مشکل کام صرف تنہائی میں ہو سکتا ہے ۔ چاہے وہ کام بھیڑ کا ہی کیوں نہ ہو ۔

محقق گھر سے کھوج کے لیے نکلتا ہے ۔ تنہا ۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو اس لیے نہیں لے جاتا کہ اپنی

ریسرچ سے دُنیا کو چونکا سکے۔ گلی سڑی کرم خوردہ مٹی کو ہاتھ لگاتا ہے۔ تنہائی میں اس کو جانچتا ہے۔ اسے سونا بنا دیتا ہے۔ زمین پر بیکار پڑی مٹی بحث اور مزید ریسرچ کا موضوع بن جاتی ہے۔

غوطہ خور کو دیکھیے۔ اسے بحرِ ذخّار سے موتی نکالنا ہے۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔ تنہا سمندر کی گہرائی میں اترتا ہے۔ کسی کے سہارے بیٹھا رہے تو موتی کیسے ملے۔

بڑے بڑے پیچیدہ اور خطرناک مقدمات کا فیصلہ کرنے سے پہلے جج تنہائی میں تمام معاملات پر غور کرتے ہیں۔ تنہائی میں ہی فیصلے لکھتے ہیں۔ یہ مسئلہ تنہائی کے بغیر حل ہو ہی نہیں سکتا۔ تنہائی رحمت ہے تو زحمت بھی۔

لیڈروں، مجمع بازوں، مشاعرہ بازوں، گروہ بازوں، پینترے بازوں اور شعبدہ بازوں کی زندگی میں تنہائی موت ہے۔ انھیں ہر وقت ایسے لوگوں کی تلاش ہے۔ جو ان کی بات سنیں بلکہ ان ہی کی بات سُنیں اور سنتے جائیں۔ جب ان کی بات کوئی نہیں سُنتا تو ان کی زندگی ناکارہ بن جاتی ہے۔ ذہنی طور پر ان کی موت ہو جاتی ہے۔ تنہائی کا بھوت انھیں کاٹنے دوڑتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے بچتے ہیں۔

کسی ذہنی مریض کو دیکھیے۔ ہر وقت تنہا رہنا چاہے گا۔ سوچتا، سوچتا اور مزید سوچتا۔ اس سے مرض میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ایسے مریض کو دوسروں کے پاس بیٹھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ایک منٹ تنہا نہیں رہنے دیتے۔ تنہائی ان کی زندگی کے لیے خطرہ ہے۔

انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔ اسے تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ تیمار دار ہر وقت سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ورنہ بیماری کیسے جائے۔ کچھ لوگ تنہائی کو اپنے اوپر لاد لیتے ہیں۔ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے تنہا رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی ذات کے سوتے سوکھ جاتے ہیں۔ احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے لوگ محفلوں میں نہیں جاتے۔ چلے بھی جائیں تو خود کو تنہا ہی محسوس کرتے ہیں۔ تنہائی میں انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ عمل کی زندگی بھول جاتا ہے۔ جو ملتا ہے صبر و شکر سے گزارہ کرتا ہے۔ مقدر پر بھروسہ کرتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ یہ تنہائی ملک اور قوم کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسروں میں دلچسپی لینا اور اپنی ذات پر اعتماد نہایت ضروری ہے۔

روح کی تنہائی نہایت خطرناک ہے۔ پوری زندگی میں خلا کا احساس ہوتا ہے۔ روح کے گوشے میں نہ کوئی سائنسداں پہنچ سکتا ہے نہ ماہرِ نفسیات۔ مولوی عبدالحلیم شرر کا نکتہ ملاحظہ فرمائیے: "بعض بانکوں کے واقعات میں مشہور ہے کہ لڑائی کے بعد زخمی حریف کو اس کے گھر تک پہنچانے گئے اور وہاں سے چلے تو حریف دوست نے کہا، کیا آپ تنہا جائیں گے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ انھیں ان کے گھر تک پہنچانے آیا اور جب وہ پہنچانے چلا تو اخلاقاً پھر اس کے ساتھ ہو لیے۔ اس اخلاق میں صبح ہو گئی۔ کہ جب یہ اس کے گھر پہنچتے ہیں تو وہ ان کی مشایعت کے لیے ان کے ساتھ ہو لیتا ہے اور جب وہ ان کے گھر پہنچتا ہے تو اس کی مشایعت کے لیے ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں"۔ اور ایک بات تنہائی میں سن لیجیے۔ کہ میں نے یہ انشائیہ تن تنہا تنہائی میں لکھا ہے۔ آپ بھی تن تنہا تنہائی میں پڑھیں۔

مسئلہ

مسئلہ کا نام زبان پر آتے ہی ایک مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے کہ یہ مسئلہ ہے کیا چیز جس نے کل کائنات کو اپنے احاطہ میں لپیٹ رکھا ہے اور حل ہونے میں نہیں آتا۔ مسئلہ حل ہو گیا تو مسئلہ نہ رہا اور حل کرنے بیٹھیے تو مسئلے سے مسئلہ پیدا ہوتا نظر آئے گا۔ مسئلہ تو حل نہیں ہوگا البتہ آپ تحلیل ہو جائیں گے۔ یا پھر خود ایک مسئلہ بن جائیں گے۔ مسئلہ کا خالق کون ہے؟ ظاہر ہے کہ مالک کل کو ہی مالک مسئلہ کہا جائے گا۔ لیکن گہرائی سے دیکھیے تو مالک کل خود ایک مسئلہ ہے۔ مالکِ کل کے سامنے کائنات بنانے اور پھر کائنات کی بنی ہوئی شکل دیکھنے میں پورے سات دن لگے۔ لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دقتوں کا سامنا ہوا ہوگا۔ محنت صرف ہوئی ہوگی۔ پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ یہ مسئلہ کیوں پیدا کیا گیا یا کھڑا کیوں کیا گیا۔ پھر کن کن مراحل کو عبور کیا گیا۔ مالکِ کل کو یہ مسئلہ پیدا کرنے کا خیال کب آیا؟ کس طرح آیا اور کیوں آیا؟ یہ ایک ہی مسئلہ آج تک حل نہیں ہوا۔ اس ایک مسئلہ پر ہی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ بڑے بڑے فلاسفر، مؤرخ، ریسرچ اسکالر ٹکریں مارتے رہے ہیں۔ ٹکریں مار رہے ہیں اور رہتی دُنیا تک ٹکریں مارتے رہیں گے لیکن یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ مسئلہ حل تو تبھی ہو جب پہلے اس مسئلہ کے خالق کا مسئلہ حل ہو۔ مسئلہ کے خالق کا ہی مسئلہ حل نہیں ہوا تو کائنات کا مسئلہ کس طرح حل ہو۔ بات اتنی ہی ہو تو ہم بھی میدان میں کود دیں اور خالق مسئلہ سے ملاقات کا سلسلہ بنائیں اور انٹرویو لیں۔ لیکن خالق مسئلہ سے ملنا بھی تو ایک مسئلہ ہے۔ فی الحال خالق مسئلہ اور مسئلہ کائنات کو چھوڑیئے۔ اور آگے قدم بڑھائیے۔

لیکن ذرا ٹھہریئے۔ ایک بات یاد آئی۔ مالکِ کائنات نے ایک مسئلہ پیدا کیا۔ وہ آدم اور حوّا کی شکل میں

نمودار ہوا۔ انھیں کسی بات سے منع کیا۔ انھوں نے پروا نہیں کی۔ مالکِ کل نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ اور انھیں عرش سے فرش پر دھکیل دیا۔ پھر کیا تھا مسائل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ لگتا یوں ہے کہ اللہ میاں اور آدم نے مل کر نیا کو مسائل میں الجھانے کا نقشہ تیار کیا اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب انسان سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو وہ مالکِ کائنات کے حضور میں حاضر ہو جاتا ہے اور سر بسجدہ اپنے مسئلے کو پیش کرتا ہے۔ اور پھر گڑگڑا کر دعائیں کرتا ہے۔ مالکِ کائنات وہاں کہاں یہ مسئلہ کون حل کرے۔ لیکن مالکِ مسئلہ کا کرشمہ دیکھیے کہ نہ جانے کب سے مسائل پیش ہو رہے ہیں اور نہ جانے کب تک ہوتے رہیں گے لیکن مالکِ مسئلہ ایک بھی مسئلہ حل نہیں کرتا اور مسائل میں پھنسے لوگوں کو اپنے حضور میں حاضر بھی رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی آج تک حل نہیں ہو سکا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ لیجیے ایک جماعت ایسی بھی ہے جو مالکِ کل عرف مالکِ کائنات عرف مالکِ مسئلہ کے وجود کو نہیں مانتی۔ نہ مانے۔ مالکِ کل کو پرواہ ہی کیا ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ وہ جماعت مسائل میں نہ الجھے۔ محققین کی رائے ہے کہ جتنے مسائل اس جماعت نے پیدا کیے ہیں اور جتنے مسائل میں یہ لوگ الجھے ہوئے ہیں اتنے مسائل کسی اور کے ہیں ہی نہیں۔ مگر ہم ان کے مسائل میں کیوں الجھیں۔ چھوڑیے اور آگے قدم بڑھائیے۔ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں لگ سکا کہ وہ جماعت کون سی ہے۔

آپ خود ہی فرمائیے بات کس موضوع سے شروع کروں۔ ہر ملک کا مسئلہ ہے۔ ہر شہر کا مسئلہ ہے۔ ہر گاؤں کا مسئلہ ہے۔ ہر مکان کا مسئلہ ہے۔ ہر فرد کا مسئلہ ہے۔ چلیے بچے کی زندگی سے ہی شروعات کرتے ہیں۔ بچہ پیدا نہیں ہوا مسئلہ۔ یہ مسئلہ تو اتنا بڑا ہے کہ گھرانے تباہ و برباد کر دیے۔ بچہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ گھر کا نام کیسے چلے گا۔ چنانچہ دوسری بیوی آگئی۔ پہلے اسے لانے کا مسئلہ۔ اسے لانے سے پہلے پہلی بیوی کو منانے کا مسئلہ۔ یا اسے چھوڑنے کا مسئلہ۔ دوسری بیوی کے بچہ ہو گیا تو پہلی بیوی کا مسئلہ۔ اور دوسری بیوی کے آنے پر اس کے بچہ تو نہ ہوا اور پہلی بیوی کے ہو گیا تو دوسری بیوی کا مسئلہ۔ دونوں کے ہی بچے پیدا نہ ہوئے تو خاوند کا مسئلہ۔ بچہ پیدا ہونے سے پہلے یہ مسئلہ کہ پیدا کہاں ہو۔ گھر پر، ہسپتال میں، اپنے گھر یا شہر میں یا بیوی کے گھر اور شہر میں۔ یہ مسئلہ ابھی مسئلہ ہی بنا رہا کہ بچہ مردہ پیدا ہو گیا۔ لو مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اگر صحت مند پیدا ہوا تو اسے نظرِ بد سے بچانے کا مسئلہ۔ یہ تو آپ روز سنتے ہی ہیں کہ ہسپتالوں سے بچے چرائے جاتے ہیں۔ غلطی سے چوک ہو گئی اور بچہ چرا لیا گیا تو مسئلہ۔ اور اگر کہیں لڑکے کی بجائے لڑکی ہو گئی تو مسئلہ۔ اور لڑکیاں ہی ہوتی رہیں تو مسئلہ ایک بھیانک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک لڑکا حاصل کرنے کی خواہش میں آٹھ دس لڑکیاں ہو گئیں تو سمجھیے مسائل کی دلدل میں دھنس گیا۔ اولاد کو لائق بنانے کا مسئلہ۔ لائق نہ بننے کی صورت میں نالائق رہ جانے کا مسئلہ۔ والدین کا کہنا نہیں مانا تو مسئلہ۔ وہ وقت گئے جب والدین کا کہنا ماننا فرض تھا۔ اب تو کہنا نہ ماننا فرض ہے اس لیے مسئلہ اور سخت ہو گیا۔ اسکول میں داخل ہونے کا مسئلہ۔ پاس ہونے کا مسئلہ۔ اچھے نمبر لینے کا مسئلہ۔

غرضیکہ روزِ پیدائش سے مسائل شروع ہو گئے۔ یہ تو حالت ہے ان کی جن کی شادی ہو گئی اور جن کی نہیں ہوئی ان کے لیے شادی مسئلہ۔ آج کل ایک اور مسئلہ پریشان کر رہا ہے۔ وہ ہے جہیز لانے کے لیے تنگ کرنے کا مسئلہ۔ طعنہ دینے کا مسئلہ۔ اور حسبِ پسند رقم یا اسکوٹر یا موٹر نہ ملنے پر نئی بیاہتا کو جلانے کا مسئلہ۔ پھنس گئے تو خود کو بچانے کا مسئلہ۔ دیکھا آپ نے۔ ابھی یہ تو سنی سُنائی باتیں ہیں "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ ہم تو راستہ ہی بھٹک گئے۔ ابھی تو کالج یا یونیورسٹی پہنچے ہی نہیں۔ پہلے تو کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا مسئلہ۔ سفارش سے زور سے۔ ہیرا پھیری سے داخلہ لے لیا تو ہر روز کی ہڑتال کا مسئلہ۔ کبھی طلبا نے کر دی۔ کبھی استادوں نے۔ پہلے طلبا استادوں سے ڈرتے تھے اب استاد طلبا سے ڈرتے ہیں۔ نیا مسئلہ۔ امتحان پاس کر لیا۔ کاروبار کا مسئلہ۔ نوکری کا مسئلہ۔ پیسہ خوب کمالیا۔ بلیک سے، اسمگلنگ سے تو خرچ کرنے کا مسئلہ۔ پیسہ نہیں ہے تو پیسے کا مسئلہ۔ پڑوسی کے گھر میں ٹیلی ویژن آگیا۔ اپنے گھر میں ٹیلی ویژن لانے کا مسئلہ۔

حکومت بنانے کا مسئلہ۔ حکومت چلانے کا مسئلہ۔ پھر حکومت قائم رکھنے کا مسئلہ۔ آیا رام گیا رام کا مسئلہ۔ اپوزیشن کا مسئلہ۔ مسئلوں سے بچنے کا مسئلہ۔

شروع زندگی سے لے کر زندگی کے خاتمہ تک مسائل میں پھنسا انسان مسائل میں ہی اُلجھا رہتا ہے۔ ایک مسئلہ سے دوسرا مسئلہ اور پھر تیسرا مسئلے منہ پھاڑے کھڑے رہتے ہیں۔ اور مالک مسئلہ ساتویں آسمان پر آرام سے اور تمام مسائل سے بے نیاز لوگوں کے مسائل کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور لطف لے رہا ہوتا ہے۔

یہ تو رہا مسئلہ کا ایک پہلو۔ جہاں مسئلہ مسئلہ ہی بنا رہتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ اس کائنات میں ایسے انسان بھی ہیں جو مسائل کی پرواہی نہیں کرتے۔ نہ وہ مسائل پیدا کرتے ہیں۔ نہ مسائل میں اُلجھتے ہیں۔ وہ چاند پر کمندیں پھینکتے ہیں۔ سمندر کی تہوں میں اتر جاتے ہیں۔ سر بفلک چوٹیوں پر جا کر ناچتے ہیں۔ بھنگڑے ڈالتے ہیں۔ زندگی کو تماشہ سمجھتے ہیں۔ خوب کماتے ہیں۔ خوب کھاتے ہیں۔ شیروں سے بھڑ جاتے ہیں۔ انھیں قابو کر لاتے ہیں۔ پنجرے میں ڈالتے ہیں۔ پھر انھیں سدھاتے ہیں۔ گھنے، ڈراؤنے جنگلوں میں جا کر شکار کرتے ہیں۔ جس طرح مداری بندر کو نچاتا ہے وہ مسائل کو نچاتے ہیں۔ زندگی ان کے اشاروں پر چلتی ہے۔ ناچتی ہے۔ مسائل ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔

لیجئے تصویر کے دونوں رُخ آپ کے سامنے پیش کر دیے۔ اب آپ مسائل میں الجھیے یا مسائل کو الجھائیے یا ان سب باتوں سے بے نیاز زندگی کا لطف لیجیے۔ یہ آپ کا کام یا دوسرے معنوں میں آپ کا مسئلہ۔

مَیں تو چلا۔

تصویر

اس ملک میں پچاسوں زبانیں ہیں۔ ہر زبان کا اپنا لب و لہجہ ہے۔ اپنے صوتی تاثرات ہیں۔ اپنا ترنم ہے۔ اپنی شیرینی ہے۔ اپنا حسن ہے۔ اپنا رنگ و آہنگ ہے۔ بیان کرنے کا انداز الگ الگ ہے۔ ہر زبان کی اپنی رُوح ہے۔ اپنا جادو ہے۔ اپنی کشش ہے۔ آپ زبانوں کو جاننا چاہیں، سمجھنا چاہیں، پرکھنا چاہیں تو آپ کو زبان دان بننا پڑے گا۔ لیکن تصویر خموش۔ پُر سکون اور پُر اسرار ہوتے ہوئے بھی بولتی اور ہم کلام نظر آتی ہے۔ تصویر کی زبان ناظر کو زبان دیتی ہے۔ بولنا سکھاتی ہے۔ اپنے تخیل سے کام لینے کا موقع دیتی ہے۔ ذوقِ نظر اور بصیرت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ سحر زدہ کر دیتی ہے۔ فکر و نظر، سوز و گداز اور قلب و جگر رکھنے والے دل و دماغ کو تو مصور تک بنا دیتی ہے۔

مصوری پُر اسراریت ہوتی ہے۔ مصوری زندگی کا آئینہ ہے۔ مصوری مخفی پہلوؤں کا انکشاف ہے۔ جذب و جنون کی حکایت ہے۔ مصوری ذہنی توانائی اور روحانی بلندی سے پیدا ہوتی ہے۔ مصوری میں زندگی کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ مصوری ایک تہذیبی عمل ہے۔ ایک کرشمہ ہے۔ ایک معجزہ ہے۔ مصوری میں قوموں کی انا کا اظہار ہوتا ہے۔ تصویروں میں بوقلمونی، الفاظ و معانی، افکار و تاثرات، تشبیہہ و تمثیل، استعارہ و کنایہ، وجدان و عرفان، نظم و ضبط، اسلوبِ فن، اور اسلوبِ فکر، سوز و ساز، موسیقی، رقص، نقاشی، سنگ تراشی، ترنم، آہ اور واہ چھپی ہوتی ہے۔ ان میں حلاوت، نزاکت، جمالیت اور تر و تازگی پائی جاتی ہے۔ مصوری ایک فن ہے اور تصویر فن کار کی پیش کش۔

مصوری عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ، غور و فکر، باریک بینی، فراست اور ذہانت، تاریخ سے شناسائی،

سیر و سیاحت، شعر و شاعری سے رغبت، فنونِ لطیفہ اور قدرتی مناظر سے والہانہ اُنس چاہتی ہے۔ فن کے نکات، رنگوں کی حلاوت اور ان کا صحیح استعمال، مختلف رنگوں کا امتزاج جاننے کے لیے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی رنگوں کی حدت اور کبھی ان کی نرمی جادو جگاتی ہے۔ کہیں پنسل اسکیچ، کہیں آبی رنگ۔ کہیں تیل کے رنگوں میں رنگے رنگ اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔ ہر تصویر میں نیا پن لانے کے لیے مشق کی ضرورت ہے۔ نئے موضوعات اور اختراعات کو تصویری قالب میں ڈھالنے کے لیے ذہانت اور چابک دستی درکار ہے۔ منکسر المزاجی، قوتِ برداشت اور سُبک خرامی کے بغیر اس نازک اور لطیف فن پر عبور حاصل کرنا نہایت مشکل ہے۔ جب تک خداداد صلاحیت موجود نہ ہو، اس وادی میں قدم رکھ ہی نہیں سکتا۔

تصویر اور شاعری کا گہرا تعلق ہے۔ شاعر لفظوں کے تخلیقی کرب سے گزر کر غزل لکھتا ہے۔ مصوّر اپنی تصویر میں تغزل لاتا ہے۔ مصوّر شاعر کا پورا دیوان تصاویر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ شاعر تصویروں سے دیوان لکھ ڈالتا ہے۔ کہیں شاعر مصوّر کو اکساتا ہے تو کہیں مصوّر شاعر کے پہلو میں گدگدی پیدا کرتا ہے۔ شاعر تشبیہات اور استعاروں سے اظہارِ خیال میں وسعت لاتا ہے تو مصوّر رنگوں اور خطوں کی حلاوت سے۔ ادب اور فن کا یہ حسین امتزاج مصوّر اور شاعر کو اور تصویر اور شاعری کو زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔

تصویر مصوّر کی بھرپور مدد کرتی ہے۔ خود کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیتی ہے۔ میں میخ نہیں نکالتی۔ اسے پتہ ہے کہ اس کی نمائش ملکوں ملکوں ہوگی۔ آرٹ گیلریوں میں اس کو جگہ ملے گی۔ نقادانِ فن دور دراز سے اسے دیکھنے، پرکھنے اور ملنے کے لیے آئیں گے۔ وہ بھی ان سے ملے گی۔ ان کی رائے جانے گی۔ اس میں نیا خون، نیا جوش، نیا ولولہ پیدا ہوگا۔ لیکن تصویر کا اپنا مزاج ہے۔ اپنا موڈ ہے۔ اگر اس کی طبیعت اپنی تصویر بنوانے کی نہ ہو تو مصوّر لاکھ سر پٹکے ایک خط بھی صحیح ہونے نہیں دے گی۔ یہی تصویر کی طاقت اور یہی اس کی توانائی ہے۔

میں چہل قدمی کے لیے باغ میں پہنچا۔ صبح کا عالم تھا۔ نسیمِ سحری انگڑائی لیتی۔ لڑکھڑاتی اور اپنا جادو جگاتی صحنِ چمن میں قدم دھر رہی تھی۔ شاخیں جھوم جھوم کر کورنش بجا لا رہی تھیں۔ کلیاں چٹک رہی تھیں۔ پھول مسکرا رہے تھے۔ کھل رہے تھے۔ باغ مہکا ہوا تھا۔ شاخوں پر لدے پھل ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شاخِ گل کی کج ادائی، گلوں کی رعنائی، سُنبل کی سیہ مستی، دزدیدہ نگاہوں سے نرگس شہلا کی نظارہ بازی۔ قطرہ ہائے شبنم کی جھلک، حوض آئینہ کی صاف صورت۔ مثلِ بلور شفاف پانی۔ ان میں پھدکتی تیرتی چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیاں دیکھ کر میں مسحور ہو گیا۔ فوارہ اپنی پوری طاقت سے آسمان کو چھونے کے لیے بیتاب تھا۔ کہیں گلِ ریحان، کہیں عشق پیچاں، پرندوں کی چہک، پپیہے کی پی ہو پی ہو۔ کوئل کی کوک، فاختہ دستک زبان، قمری کو کو کناں، ایسے میں برق سے نہ رہا گیا۔ بادل بھی اُمنڈ آئے۔ باغ بن اور نکھار آیا۔ منقارِ بلبل نغمہ ریز ہوئی۔ طوطی نے خوش نوائی شروع کی۔ طاؤس اس نظارہ کی تاب کیسے لاتا۔ اس نے بھی وجد

میں آکر رقص شروع کیا۔ پتّہ پتّہ نغمہ زن تھا۔ اچانک میری نظر ایک مصوّر پر پڑی جو اپنے سامان سے لیس گلوں سے گفتگو کرتا۔ شاخوں کو گالوں سے مَس کرتا نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے مصوّر کے دل میں ایک جذبہ اُبھرا، اس میں شدّت پیدا ہوئی۔ اب وہ اضطرابِ پیہم، سوزِ مجسّم اور کربِ مسلسل میں گرفتار تھا۔ اس کے اندر وجدان اور عرفان کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک نشہ اس پر طاری ہوا اور وہ ان تمام مناظر کو مختلف تصاویر کی شکل میں ڈھال کر ہی اترا۔ میں اس کی تصویروں کو خود تصویر بنا دیکھتا رہا۔ حُسن اور عشق کا یہ امتزاج اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر تھا۔ مَیں بے خود کھڑا رہا۔ نہ جانے کب تک۔

مجھے تصویروں سے اُنس پیدا ہوا۔ نمائش ہوئی۔ گیلریاں مختلف تصاویر سے مزیّن تھیں۔ ایک تصویر دیکھی۔ آبشار سے پانی بل کھاتا، اٹھلاتا ڈھلان کی طرف گر رہا تھا۔ سورج کی ہلکی سنہری کرنیں پانی کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ایک دوشیزہ دراز قامت، کتابی چہرہ، ترشی ہوئی باہنیں، لمبی اور لچکیلی گردن، پرکشش بڑی بڑی کالی اور غزالی آنکھیں، حُسن وجمال کا دلکش اور دل نواز پیکر پھولوں کا گجرا سجائے آبشار کے پاس نہانے کے لیے کھڑی تھی۔ اگلی تصویر میں وہی دوشیزہ نیم عریاں لباس میں آبشار کے نیچے بیٹھی تھی۔ اس کے سر کی گھنی، کالی، گھنگھرالی۔ لمبی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ سینے کی گولائی اور اُبھار دم بخود کیے دے رہا تھا۔ میری حالت اس وقت غیر ہوئی جب میں نے اگلی تصویر میں دیکھا کہ اس دوشیزہ کے مرمریں جسم کے ساتھ چپکی گیلی ساڑھی تھی اور زلفوں سے پانی کی سفید بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ مَیں اس نظارہ کی تاب نہیں لاسکا۔ پھر کیا ہوا۔ ایک طویل داستان ہے۔ پھر سہی۔

خواب

دُنیا بھر کی خاک چھانی ۔ مُلکوں مُلکوں دانشوروں سے ملے ۔ سائنس دانوں کے دروازے کھٹکھٹائے ڈاکٹروں سے ملاقاتیں کیں ۔ جاننا محض یہ تھا کہ خواب کی ماہیت کیا ہے ۔ یہ کیوں آتا ہے ۔ کہاں سے آتا ہے ۔ کہاں جاتا ہے ۔ کہاں رہتا ہے ۔ کب آتا ہے ۔ کب جاتا ہے ۔ آتا ہے تو پھر جاتا کیوں ہے ۔ سُنا بھی ہے اور پڑھا بھی ۔ دیکھا بھی ہے اور پرکھا بھی کہ ہر کام کا وقت مقرر ہے ۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے اپنے غالب صاحب فرما گئے ہیں "موت کا ایک دن معین ہے" تو کیا خواب کے آنے کا وقت بھی مقرر ہے ۔ یا اس کی اپنی موج ہے کہ جب چاہے آئے جتنی دیر چاہے ٹھہرے ۔ جب جی چاہے چلا جائے پھر یہ کیا کسی جیٹ ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہے ۔ یا اس کو اللہ تعالیٰ نے طاقتِ پرواز عطا کی ہے جو پلک جھپکتے ہی پہنچ جاتا ہے ۔ جب کسی سوال کا جواب نہ ملا تو پھر ہم نے پوچھا کہ یہ بِن بلائے کیوں آتا ہے ۔ بتا کر کیوں نہیں آتا بلکہ للکار کر کیوں نہیں آتا ۔ پھر نیند میں ہی کیوں آتا ہے ۔ جاگتے ہوئے تشریف لانے میں اسے کس کا خوف ہے ۔ اور پھر یہ کہ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ انسان دن بھر کی محنت کے بعد تھک کر سویا ہو اور نیند میں خلل ڈالنے کے لیے یہ پہنچ جائے ۔ اور یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ دوسروں کے پھٹے میں بلاوجہ ۔ بلا مطلب ۔ بلا ضرورت ٹانگ اڑائے ۔ غضب تو یہ ہے کہ اسے روکنے والا کوئی نہیں سُنا یہ بھی ہے کہ یہ رُکنے والا بھی نہیں ۔ پھر اس کام سے اسے کیا فائدہ پہنچتا ہے ۔ غرض و غایت کیا ہے ۔ عوضانہ نہیں مانگتا ۔ مفت دینے پر بھی کچھ نہیں لیتا ۔ باز بھی نہیں آتا ۔ یہ اور کیا کیا کام کرتا ہے ۔ اس کا گزارہ کیسے ہوتا ہے ۔ یہ کھاتا کیا ہے ۔ لباس کیسا پہنتا ہے ۔ بولتا ہے تو کس زبان میں ۔ کیا اُردو میں بھی بولتا ہے ۔ اگر بولتا ہی نہیں تو کیا اشاروں سے ہی

کام نکالتا ہے۔ یا کچھ بھی نہیں کرتا۔ ان سوالوں کا جواب بھی نہ ملنے پر ہم نے آخری سوال کیا کہ قید خانوں میں جہاں دس دس تالے پڑے ہوتے ہیں اور بند مقفل کمروں میں، جو چاروں طرف سے بند ہوتے ہیں اور جہاں قیدی موت کی گھڑیاں گن رہے ہوتے ہیں۔ اور جہاں قید خانوں کے باہر سپاہی بندوقیں تانے، چیختے چلاتے، پہرہ دے رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب کی آنکھ میں دھول جھونک کر اور بغیر تالے کھولے قیدیوں کے کمرے میں کیسے پہنچ جاتا ہے اور ملاقات کر آتا ہے اور پھر باہر بھی آجاتا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ محلوں میں جہاں کسی پرندے کی تو کیا مجال مکھی کی مجال نہیں کہ پر مار جائے۔ یہ نیند میں سوئی بیگمات اور رانیوں سے ملاقات کر آتا ہے اور پاس ہی پڑے نوابوں اور مہاراجاؤں کو پتہ تک نہیں لگنے دیتا۔ بلکہ آنا آنا راجاؤں اور نوابوں سے بھی مل آتا ہے اور ان کی بیگمات اور رانیوں کو علم نہیں ہونے دیتا۔ جہاں جانا چاہتا ہے جاتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اسے روکے یا ٹوکے۔ مختصر یوں کہ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر ہم لائبریریوں میں پہنچے یا یوں کہہ لیجیے کہ خوابوں کی دُنیا میں پہنچے۔ سینکڑوں کتابیں ایسی ملیں جن میں خواب کی تعبیریں، خواب کی تفسیریں، خواب کی داستانیں خواب کی رنگینیاں، خواب کے معرکے، خواب کی شرارتیں، خواب کے قصے، خواب کے مسئلے، خواب کے کرشمے، خواب کے کھٹکے، خواب کے نظارے، خواب کے تانے بانے سب کچھ درج تھا۔ سینکڑوں واقعات کا بیان تھا جہاں خوابنے زندگیاں ویران کر دی تھیں۔ خواب نے پاگل بنا دیے تھے۔ خواب نے زندگی کو زندگی دی تھی۔ ڈراؤنے خواب، بھیانک خواب، لطیف خواب کی وہ تفاصیل تھیں کہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کبھی پڑھتے پڑھتے ہم پر خوف طاری ہو جاتا۔ کبھی ہم مسکرا رہے ہوتے۔ کبھی ہمارے دل میں گدگدی ہوتی۔ کبھی لہرسی اُٹھتی۔ پھر مذہبی کتب کی طرف لپکے۔ ہر کتاب میں خواب کا تذکرہ۔ کچھ تو خواب پر شروع ہوئیں۔ خواب پر ختم ہوئیں۔ مذہب کا ذکر کم تھا اور خواب کا ذکر زیادہ۔ ایک منچلے نے تو یہ بھی لکھ رکھا تھا کہ خواب تو خدا کو بھی آتا ہے۔ خواب نہ آتا تو دنیا ہی وجود میں نہیں آتی تھی۔ ایک اور صاحب نے تو جو متعدد کتب کے مصنف ہیں اور جن کا گہرا مطالعہ بھی ہے یہاں تک لکھ دیا کہ خواب ایک حقیقت ہے اور خدا ایک خواب ہے۔ بہر حال ہمیں بہت کچھ ملا مگر ہمارے سوالات کا جواب نہ ملا۔ اسی اثنا میں کچھ اور سوال سوجھ گئے۔ لیکن ایک خیال یہ بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں آپ یہ تو نہیں سوچ رہے کہ ہم خواب میں بڑبڑا رہے ہیں۔ یہ لکھتے لکھتے ایک دو بار یہی خیال ہمیں بھی آیا۔ لیکن ایک ماہرِ نفسیات کا نسخہ ہمارے پاس موجود تھا۔ چنانچہ ہم نے پہلے تو اپنی آنکھوں پر چھینٹے دیے بلکہ غسل ہی کر ڈالا۔ تاکہ شک کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ مزید تسلی کے لیے منہ پر چپت لگائے۔ جسم کو دانتوں سے کئی جگہ کاٹا۔ جس انگلی سے ہم لکھ رہے تھے۔ چبائی اور پوری طرح سے اطمینان کرنے کے بعد کہ ہم بالکل خواب میں نہیں، مزید تسلی کرنے کے لیے دوستوں، اڑوسیوں پڑوسیوں کے پاس پہنچے تاکہ ان سے بھی سرٹیفیکیٹ لے آئیں کہ ہم خواب میں نہیں۔ ایک دوست تو خاموش ہو گئے۔ دوسرے نے بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ تیسرے نے ہنسی اُڑا ڈالی۔ چوتھے نے تضحیک کر ڈالی۔ پانچویں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ چھٹے نے مذاق اُڑایا۔ ساتویں نے کراری پھبتی کس دی۔ آٹھویں نے ٹھٹھا کیا۔ نویں نے ہمیں کسی ماہرِ نفسیات کے پاس جانے کی رائے

دی ۔ دسویں دوست نے رمز کو پہچان لیا اور جب یہ کہا کہ میاں خواب میں تو نہیں ہو مگر باتیں ایسی کر رہے ہو جیسے خواب میں ہو۔ ہماری تسلی ہو گئی کہ ہم خواب میں نہیں ہیں۔ آپ چاہیں تو اطمینان فرمالیں۔ لیکن پہلے خود اطمینان کرائیں کہ آپ تو خواب میں نہیں۔ طریقہ آپ کو بتا ہی دیا گیا ہے۔ ہاں تو ہم لائبریری میں بیٹھے اور کتابوں میں اُلجھے بلکہ لیٹے لیٹے خواب کی باتیں سوچ رہے تھے۔ ایک مصنف نے تجزیہ ان الفاظ میں کیا تھا کہ دُنیا ایک خواب ہے اور خواب ہی دُنیا ہے۔ ایک ماہر نے ایک واقعہ بیان کر رکھا تھا کہ ایک بہت بڑے فلاسفر کو خواب میں یہ محسوس ہوا کہ وہ فلسفے کے تانے بانے سلجھا رہا ہے۔ سلجھاتے سلجھاتے الارم نے اُسے جگا دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے سرے کو پھر پکڑ لیا۔ تا دمِ تحریر وہ اسے سلجھاتے نظر آئے۔ ہم لائبریریوں کو کھنگالتے چلے جا رہے تھے اور خواب ہمارا پیچھا کرتا چلا جا رہا تھا۔ ہم تھک کر ایک آرام کرسی پر دراز ہوئے ہی تھے کہ ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہ خواب میں خواب پھنس جاتا ہے اور پھر ایک خواب۔ اسی کے درمیان دوسرا اور پھر تیسرا یعنی خوابوں کی دُنیا بستی نظر آتی ہے اور خواب ختم ہونے میں نہیں آتا۔ تب ہم نے سمجھا کہ یہ ہزار داستان، فسانۂ آزاد، طلسمِ ہوش ربا، سنگھاسن بتیسی، بتیال پچیسی سب خواب میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے مصنف کوئی بھی ہوں کارنامہ سب خواب کا ہی ہے۔ اپنے سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے بعد ہم اس معاملہ کی گہرائی سے چھان بین کریں گے۔ محنت سخت کرنی پڑے گی کیونکہ کتابوں کے خالق راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ لائبریری سے تھک ہار کر نکلے سینما کا خیال آیا۔ اُدھر چل پڑے۔ جس سینما میں پہنچے وہاں سیکس کے متعلق فلم لگی ہوئی تھی۔ ٹکٹ ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ فلم دیکھے بغیر واپس آنے کا بھی سوال نہیں تھا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ فلم کا اثر گہرا ہوتا ہے۔ فلم دیکھی، دل بہت خوش ہوا۔ رات کو یہ خیال لے کر سو گئے کہ وہی سین رات کو خواب میں دیکھیں گے۔ اور مفت دیکھیں گے۔ صبح اُٹھے تو دیکھا کہ خواب تو نہیں آیا تھا، بدخوابی آ گئی تھی۔ لیجیے یہ بھی تجربہ ہو گیا۔ نہ ہوتا تو کیسے بتاتے۔

ذرا ٹھہریئے لائبریری کی ہی ایک بات اور یاد آئی۔ اس میں کچھ شعراء کی ایسی کتابیں تھیں جن کے عنوانات میں خواب موجود تھا۔ جیسے "آؤ کہ کوئی خواب بنیں"۔ "خوشبو کا خواب"۔ "خوابوں کی دُنیا"۔ "خوابوں کے گلاب"۔ ایک شاعر کا تخلص سپن ملا۔ سپن ہندی کا لفظ ہے لیکن اس کے معنی خواب ہیں۔ یہ بھی انکشاف ہو گیا کہ خواب ہندی میں شاعری کرتا ہے۔ صاحبِ کتاب ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک نہایت اہم اور قابلِ ذکر خیال آیا۔ کہ خواب ہر ذی ہوش کو آتا ہے اور ذی ہوش کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور ہر سیکنڈ لاکھوں بڑھتے جا رہے ہیں۔ تو کیا ہر پیدائش کے ساتھ ایک خواب بھی پیدا ہوتا ہے اور اس خواب کا تعلق اس پیدائش سے ہی ہوتا ہے۔ مزید غور کرنے پر یہ بات صحیح بھی نظر آئی کیونکہ مرنے کے بعد خواب محض ایک خیال ہی رہ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے مُردہ خواب میں ہی رہتا ہو اور اس کا خواب کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہو۔ یہ جاننے کے لیے ہمیں خود مرنا پڑے گا۔ کیونکہ کوئی مُردہ ہمیں کچھ بتانے نہیں آئے گا۔ خود جانے پر بھی کچھ نہیں بتائے گا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ پہلا کام مکمل ہو تو دوسرے کو ہاتھ ڈالیں۔

آخر میں ہم بہ ثباتِ ہوش و حواس خمسہ بلاترغیب غیرے تحریری طور پر لکھ دیتے ہیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت ضرورتمندوں کے کام آئے کہ ہم نے خواب کی باتیں کی ہیں۔ خواب میں نہیں کیں حالانکہ خواب کی باتیں خواب میں ہی کرنی چاہیئے تھیں۔

لغزش

ہمیں یہ تو پتہ تھا کہ لغزش کیا ہے کیونکہ جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے اب تک ہمارا سابقہ لغزشوں سے ہی رہا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ لغزش کی تاریخِ پیدائش کیا ہے۔ وقتِ پیدائش کیا ہے۔ اور جائے پیدائش کیا ہے۔ یہ جاننے کے لیے ہم نے کتنے ہی پاپڑ بیلے۔ ہمیں کتنی ہی لغزشوں کا سامنا کرنا پڑا کتنی ہی لائبریریوں کے طواف کیے۔ کتنے ہی دانشوروں کے دروازوں پر دستکیں دیں۔ مگر ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ اچانک دماغ میں ایک لغزش پیدا ہوئی وہ یہ کہ پہلے لغزش کے پیدا ہونے کی وجہ دریافت کی جائے۔ چنانچہ دل اور دماغ وہاں پہنچا جہاں مالکِ کائنات آدم کو باغِ ارم سے پھل توڑنے اور کھانے کو منع کر رہے تھے اور جہاں مالکِ کائنات کے گردن گھماتے ہی آدم نے پھل توڑا۔ چکھا اور کھا ڈالا۔ بھلا مالکِ کل کو کیسے پتہ نہ لگتا چنانچہ اس حکم عدولی کی سزا یہ دی گئی کہ آدم کو جنت سے باہر نکال دیا گیا اور نیچے دھکیل دیا گیا۔ اور وہ لڑھکتے لڑھکتے زمین پر آ گرے۔ یعنی آدم کی ذرا سی لغزش کا نتیجہ یہ نکلا کہ لغزش کا وجود قائم ہو گیا۔ پھر جیسے انسان سے انسان، مسئلہ سے مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ لغزش سے لغزش پیدا ہوتی گئی۔ عرش سے فرش تک کا یہ قصہ ایک ہی لغزش کا کرشمہ ہے۔

بس یہ وہ تاریخ تھی جس روز لغزش پیدا ہوئی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں لغزش نے جنم لیا۔ وقتِ پیدائش کا پتہ پھر بھی نہیں لگ سکا۔ اب جب لغزش کے پیدا ہونے کی وجہ کا بھی علم حاصل ہو گیا ہے تو وقت کا پتہ لگنا کیا مشکل ہے۔ سنا ہے ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ وقتِ مقررہ پر اس کا بھی پتہ چل جائے گا۔ صرف وقت کی بات ہے۔

لغزش کی سطح بین الاقوامی ہے۔ اس کے مسائل بین الاقوامی ہیں۔ اسی لیے دنیا کی ہر لغت میں لغزش کے ایک

ہی معنی ہیں۔ یعنی پھسلن، پھسلاہٹ، لرزش، جنبش، غلطی، بھول، چوک، گمرہی وغیرہ۔

یہ معنی پڑھتے پڑھتے دماغ میں ایک لغزش پھر پیدا ہوئی کہ اگر باوا آدم لغزش نہ کھاتے اور مالکِ کائنات کا حکم مان لیتے تو خود بھی بچ جاتے اور کائنات کو بھی بچا لیتے۔ یا پھر مالکِ کائنات ہی ذرا نرمی سے کام لیتے۔ سرزنش کر دیتے۔ کیریکٹر رول میں انٹری کر دیتے۔ چھوٹی موٹی سزا دے دیتے۔ آئندہ کے لیے وارننگ دے دیتے۔ لیکن یہ معاملہ تو مالکِ کائنات اور باوا آدم کا اپنا تھا۔ لگتا ہے ایسا ہوا ہوگا یا کچھ نہ کچھ ہوا ہوگا۔ بہر حال یہ معاملہ ہماری چھان بین کا نہیں اور نہ ہی ہمیں دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔ یہ واقعہ بھی مورخ نہ جانے کہاں سے نکال لائے ورنہ کسے معلوم ہوتا۔ سُنا ہے کچھ نقاد اس واقعہ سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ اس معاملہ میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ مگر جب تک کوئی نئی بات وجود میں نہیں آتی یا ریسرچ اسکالر اپنی ریسرچ سے اس واقعہ کو غلط ثابت نہیں کرتے جس کا اب کوئی امکان نہیں۔ اس لیے ہمیں اس واقعہ کی صداقت میں کوئی لیت و لعل نہیں۔ سانپ نکل گیا۔ لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔ نقصان لاٹھی کا تو ہوگا ہی لکیر پیٹنے والے کا بھی ہوگا۔

لغزش واقعاتی ہے۔ واقعہ کب ہو جائے، لغزش کب آ جائے۔ کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ ایک مثال سے اس بات کو سمجھیئے۔ ہم شام کے وقت ایک باغ میں گھوم رہے تھے۔ ہوا خراماں خراماں چل رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ خراماں خراماں ہم بھی چل رہے تھے۔ سبزہ لہلہا رہا تھا۔ آسماں پر ہلکے بادل چھا رہے تھے۔ ماحول پر نشہ سا طاری تھا۔ ہمیں ایک مضبوط قسم کی ایک نہایت خوبصورت دراز قد کی لڑکی نظر آئی۔ اس کی کالی گھنی زلفیں کندھوں پر مارسیہ کی طرح لہرا رہی تھیں۔ وہ اپنے راستے پر اکیلی جا رہی تھی۔ کہ اچانک ہمارے کانوں میں ایک ہلکی سی وِسل کی آواز آئی۔ ہم چونکے۔ آنکھ اُٹھائی اور گھمائی تو دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا ادھر سے آ رہا تھا۔ یہ وسل لبوں سے اس نے ہی پیدا کی تھی اور وہ لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ لڑکی نے ایک آدھ منٹ کے لیے سوچا اور پھر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تیرتی نظر آنے لگی۔ لڑکے کا جسم کھِل اُٹھا اور وہ لڑکی کی طرف لپکا۔ ہم حیران تھے کہ یہ کیا تماشا ہے کہ سڑک کے بیچوں بیچ دو جنبی ہماری آنکھوں کے سامنے یہ حرکت کر رہے تھے۔ آگے کیا ہوتا ہے یہ دیکھنے کے لیے ہم ٹھٹھک گئے۔ لڑکا مسکراتا، ہنستا لڑکی کے پاس پہنچا ہی تھا کہ لڑکی نے مُکا تانا اور لڑکے کے جبڑے پر پوری طاقت سے رسید کیا۔ لڑکا چکرایا اور دیکھتے دیکھتے گر پڑا۔ ہم مزاج پُرسی کے لیے بڑھے۔ لڑکے کے منہ سے جو الفاظ نکلے اور ہم نے سُنے وہ یہ تھے "لغزش ہو گئی" پھر کیا ہوا یہ کہانی طویل ہے۔ اب آپ اندازہ فرمائیے کہ ایک لغزش کا نتیجہ یہ تھا کہ لڑکا جان سے جاتا۔ اور جو لغزش لڑکی سے ہوئی تھی اس کا نتیجہ اسے عمر بھر بھگتنا پڑتا۔

لغزش کا تعلق دل اور دماغ دونوں سے ہے۔ ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ دل اسے گرفت میں لے لیتا ہے دماغ اس کا فوری فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں دل کسی بات کو نہیں مانتا وہاں لغزش پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے دانشور

لغزش سے بچنے کے لیے دل پر قابو رکھتے ہیں۔ دماغ سے مشورہ کرتے ہیں لیکن لغزش اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ پھر بھی تسلط جما لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کائنات لغزش کے دائرہ میں مقیّد ہے۔ لغزشیں کھانے کے بعد اور نقصان اُٹھانے کے بعد بھی کون ہے جو لغزش نہیں کھاتا۔

ہزاروں فلمیں ایسی بنتی ہیں جن میں ذرا سی لغزش کے خطرناک نتائج دکھائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ان فلموں کا ہی اثر ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گھروں سے زیور اور نقدی چرا کر ایکٹر اور ایکٹریس بننے کے لیے نکل جاتے ہیں۔ ذرا سی لغزش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عمر بھر ان کی زندگی مصیبتوں اور دکھوں میں پھنسی رہتی ہے۔ اگر لڑکی غنڈوں کے چنگل میں پھنس گئی تو زندگی بھر روتی ہے۔ نہ گھر واپس جا سکتی ہے نہ اور کوئی راستہ اسے ملتا ہے۔

ایک نازک واقعہ دیکھئے۔ ہم بس میں سفر کر رہے تھے۔ بس اپنی اسپیڈ پر جا رہی تھی کہ اچانک اگلا دایاں ٹائر پھٹا اور بس چکر کھانے لگی۔ بس سواریوں سے لدی ہوئی تھی اور سب یہ محسوس کر رہے تھے کہ بس اُلٹ جائے گی اور نہ بس بچے گی نہ سواریاں۔ ایسے موقعوں پر ڈرائیور اپنی جان بچانے کے لیے کود جاتے ہیں۔ بچتے تو عام حالات میں وہ بھی نہیں لیکن سواریاں بالکل نہیں بچتیں۔ خوف اور ہراس کے درمیان ڈرائیور نے اپنے حواس پر قابو رکھا۔ ہمت اور دلیری سے اسٹیئرنگ پر قبضہ جمائے رکھا اور گاڑی کو بڑی ہوشیاری سے چکروں سے نکالا اور سڑک کے کنارے لا کھڑا کیا۔ اگر ڈرائیور کے دماغ میں لغزش پیدا ہو جاتی تو نتیجہ کیا نکلتا۔ وہی، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

لغزش کا اثر سیاست دانوں، شاعروں اور ادیبوں کے لیے بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کوئی سیاستداں لالچ میں یا بہکاوے میں آ کر اپنی پارٹی چھوڑ جاتا ہے اور دوسری پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک سیاستداں نے کمال ہوشیاری سے سیاست داں کو اس کی پارٹی کمزور کرنے کے لیے نکال لیا اور پھر اپنی پارٹی میں اسے کوئی پوزیشن نہیں دی۔ چنانچہ لغزش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلی پارٹی سے نکل گیا اور دوسری پارٹی نے اسے منہ نہ لگایا اور وہ کہیں کا نہ رہا۔ یہی حال شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ اپنا شعر ہے۔ اپنا مضمون ہے۔ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر کہیں لغزش کھائی اور کسی کا شعر سرقہ کر لیا۔ یا کسی کا مضمون چرا لیا۔ اور اسے اپنا کہہ کر سُنا دیا تو پھر عمر بھر کے لیے میدانِ ادب میں پاؤں نہیں جما سکتے۔ پوری زندگی لغزشوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر شخص لغزش کھاتا ہے۔ نہ کیسے کھائے جب ہمارا باوا آدم لغزش کھا گیا تو اس کی اولاد لغزش سے کیسے بچ سکتی ہے ——— ہر روز جائز اور ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں، لغزش کی وجہ سے۔ قتل و غارت ہوتے ہیں، لغزش کی وجہ سے۔ طوائفوں کے کوٹھے بھرے پڑے ہیں سب لغزش کا شکار ہیں۔ یہ تو بات ہی معمولی ہے۔ ذرا سی لغزش سے حکومتیں اُلٹ جاتی ہیں۔ سرکاریں پلٹ جاتی ہیں۔ خاندان مٹ جاتے ہیں۔ خودکشی، کردارکشی کسی لغزش کا ہی کرشمہ ہیں۔ یہ طویل کہانی باوا آدم سے شروع ہوئی اور قیامت تک رہے گی۔

آپ نے دیکھا اس مختصر انشائیے کو لکھنے میں کتنی لغزشوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

مَوت

جس طرح ایک استاد پہلوان اپنے شاگردوں کو سب داؤ پیچ سکھا دیتا ہے لیکن وہ ایک داؤ اپنے لیے محفوظ رکھ لیتا ہے۔ (ورنہ اسے استاد کون مانے) عین اسی طرح اللہ میاں نے اپنے تمام راز، حکمتیں، آسمانی صحیفوں کے ذریعہ تقسیم کر دیں لیکن زندگی اور موت کے دو فلسفے اپنے پاس رکھ چھوڑے ورنہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کون جانے۔ زندگی کب ملے گی۔ موت کب ہوگی۔ یہ کوئی نہیں جان سکا۔ اللہ میاں کب سے یہ کھیل کھیلتا چلا آ رہا ہے۔ یہ بھی کوئی نہیں جان سکا۔

کہتے ہیں زندگی کے بعد موت اور موت کے بعد زندگی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے بہار کے بعد خزاں ہے اور خزاں کے بعد بہار ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی جینے کا نام ہے اور موت مرنے کا۔ چنانچہ زندگی لطیف ہے اور موت کثیف۔ یا اسے وحشت کہہ لیجیے۔

مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ مرنے کا خیال آتے ہی ایک خوف، ایک دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ ہاتھ دعا کے لیے اُٹھ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے جابر، خونخوار جن سے موت پناہ مانگتی تھی۔ قتل عام محض اس لیے کرتے تھے تاکہ وہ خود موت کے منہ سے بچ جائیں۔

تاریخ کی ورق گردانی کیجیے تو پتہ چلے گا کہ دُنیا میں وہی لوگ نمایاں کام کر سکے ہیں جن کے دل موت کے خوف سے خالی تھے۔ آزادی کی لڑائی میں نوجوانوں نے جنھوں نے زندگی کی بہاریں دیکھی بھی نہ تھیں، ہنستے ہنستے تختۂ دار چوما۔ موت کو موت کے گھاٹ اُتار کر خود زندۂ جاوید ہو گئے۔

جان پر کھیلنا مشکل ہے مگر یاد رہے
کھیلنے پر کوئی آجائے تو آسان بھی ہے!

لق و دق میدانوں، دشوار گھاٹیوں، دھوپ، بارش کی مصیبتوں کو سہتے حملہ آور اپنے گھروں سے نکلتے سب کچھ ملیامیٹ، تاخت و تاراج کرتے۔ میدانِ کارزار میں کود پڑتے۔ موت کا خوف ہوتا تو گھر سے کبھی نہ نکلتے۔ ہر قدم پر انھیں موت کا سامنا کرنا تھا۔

ان جانبازوں کو دیکھیے جو چاند پر کمندیں پھینکتے ہیں۔ سمندروں کی تہوں میں اُتر جاتے ہیں۔ بجلی کی سی سرعت سے چلنے والے جیٹ ہوائی جہازوں میں اُڑانیں بھرتے ہیں۔ بڑی بڑی توپوں کے دہانے موڑ دیتے ہیں۔ غضب ناک جنگلی جانوروں سے بھڑ جاتے ہیں۔ انھیں قابو میں کرتے ہیں۔ انھیں سدھاتے ہیں اور اپنے حکم پر چلنا سکھاتے ہیں۔ خونخوار ڈاکوؤں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ آگ کے شعلوں میں لپٹے مکانوں میں کسی کو بچانے کے لیے گھس جاتے ہیں۔ یہ لوگ موت سے کھلواڑ کرتے ہیں اور اپنے بہادرانہ اور حیرت انگیز کارناموں سے زندگی کو زندگی دیتے ہیں۔ موت کا خوف دور کرتے ہیں۔ دنیا میں زندگی کی لہر دوڑاتے ہیں۔

دُنیا میں امراض کی کیا کمی۔ جس طرح دُنیا پھیلتی جاتی ہے اسی طرح امراض پھیلتے جاتے ہیں۔ لیکن جو کہنہ امراض ملک اور قوم کو اندر ہی اندر کھائے جا رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ خطرناک مرض موت کا ڈر ہے۔ چنانچہ مفکر فلسفی، راہ نما بار بار یہی ایک نکتہ سمجھانے میں لگے رہتے ہیں کہ موت ایک حقیقت ہے۔ اس سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ ہر وقت نڈر ہو کر اپنے کام میں جٹا رہنا چاہیئے۔ حکیم سقراط نے کہا تھا۔ "جب موت ہمیں اپنے وقت میں سے ایک لمحہ بھی نہیں دیتی تو بھلا ہم موت کو اپنی زندگی کا کوئی لمحہ کیوں دیں"۔

دُنیا کے بہت سے مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ موت کے بعد زندگی ہے اور زندگی کے بعد پھر موت ہے۔ موت چولا بدلنے کے مصداق ہے۔ یعنی انسان ایک طرح کے کپڑے اُتار کر دوسری طرح کے کپڑے پہن لیتا ہے۔ موت کے خوف سے زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بہادر انسان زندگی میں ایک بار مرتا ہے جب کہ بزدل بار بار مرتا ہے۔ مردِ حق کی نشانی ہی یہی ہے کہ موت کا ہنسی خوشی استقبال کرتا ہے۔

موت کا خوف عمل کا دشمن ہے۔ موت کا خوف انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔ ناکارہ کر دیتا ہے۔ دلوں میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے اور ہاتھوں میں رعشہ۔ دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے ہی مرنا شروع کر دیتا ہے۔

دشمن حملہ ہی جب کرتا ہے جب اسے معلوم ہو جائے کہ مخالف پر خوف طاری ہے۔ پھر اسے مخالف کو ختم کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ تمام برائیوں کی جڑ خوف ہے اور موت کا خوف موت ہے۔

اگر گہرائی میں اُتر کر دیکھا جائے تو پتہ لگے گا کہ ازل اور ابد دونوں ہی انسان کے رہینِ منت ہیں۔ اللہ تعالیٰ

نے انسان کو بے پناہ قوت دی ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ وہ اسے کیسے استعمال کرتا ہے۔

قدرت کے کسی مظہر پر غور کیا جائے، زندگی ہی زندگی نظر آئے گی پھولوں سے بھرے باغات، جھرنوں سے برستا پانی، آبشار، دریاؤں، سمندروں میں لہریں، آسمان میں قوسِ قزح، انواع و اقسام کے کھانے پھل، سبزیاں سبھی قدرت کی دین ہیں۔

جب رات ہوتی ہے۔ انسان دُنیا و مافیہا سے بے خبر سو جاتا ہے۔ صبح پھر تازہ دم اُٹھ جاتا ہے۔ ساحلِ دریا پر دیکھیے۔ بلبلہ اُٹھتا ہے۔ مِٹ جاتا ہے۔ نیا اُٹھتا ہے وہ بھی مٹ جاتا ہے۔ لامتناہی سلسلہ چلا رہا ہے۔

بلبل بہار کی عاشق ہے۔ لیکن خزاں بھی اس کے سامنے آتی ہے۔ مور برسات میں ناچ اُٹھتا ہے۔ پر پھیلا پھیلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ برسات گزر جانے کے بعد بھی وہ قائم رہتا ہے۔ پھولوں کا اپنا موسم ہوتا ہے۔ قدرت کی نیرنگیوں کا لطف تبھی لیا جا سکتا ہے جب موت کا خوف دل سے نکل جائے۔ صرف میر تقی میر کا ایک شعر سن لیجیے اور دیکھیے کہ ایک خاص طرزِ احساس، طرزِ فکر اور مخصوص فلسفہ کس طرح ایک مالا میں پرو کر پیش کیا جاتا ہے :

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر

بد قسمتی سے ہم پر مغرب کا رنگ اور اثر دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اور مغرب کی ہولناک ذہنی کیفیت ان کے ادب اور فنون کا ایک حصّہ ہے۔ چنانچہ مایوسی، خوف، دہشت وہاں کے ادب کے واضح رجحانات بن چکے ہیں۔ موت ہماری جدید نظم میں در آئی ہے۔ موت اور اس کا خوف۔ موت کے بعد کی بے معنویت ایک اذیت ناک اور دکھ بھرے لہجہ میں شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے۔ موت شاعری میں بطور علامت بھی آئی۔ موت تخریب کے ساتھ تخلیق کی شکل بھی لے کر آئی۔

زندگی حسن، ڈسپلن، امید، روشنی اور حرارت بخشتی ہے۔ موت کا خیال ان سب کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ زندگی جینے کے لیے ہے۔ اس لیے جب تک زندگی ہے۔ موت کا خیال تک نہیں آنا چاہیئے۔ موت کو آنا ہے تو ضرور آنا ہے۔ اس کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

ملک الموت کا اپنا سیکریٹریٹ ہے۔ وہاں کا کام کیسے ٹھپ ہو سکتا ہے۔ اس کو بھی اللہ میاں کو منہ دکھانا ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اللہ میاں کسی سے رعایت نہیں کرتا۔ ورنہ وہ اتنی بڑی کائنات پر حکومت کیسے کرے۔

موت کی تمنا کرنا غلط ۔ موت سے بھاگنا بزدلی ۔ زندگی کے مصائب اور آلام سے نجات پانے کے لیے زہر کا پیالہ پینا کمزوری کی دلالت ہے۔ چکبست نے زندگی اور موت کے فلسفہ کو ایک شعر میں کس خوبصورتی سے سمویا ہے :

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

ندامت

ندامت لفظ عربی زبان کا ہے۔ جب ہم عربی زبان سیکھ رہے تھے تب ہمیں اس لفظ کا پتہ لگا تھا۔ ہمیں یہ بات بتاتے ہوئے ندامت کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم عربی تو بھول گئے ہیں لیکن ندامت نہیں بھول سکے۔ شاید اس لیے کہ ہمارا واسطہ ندامت سے ہی رہا ہے۔

ہم نے ندامت کی اناٹمی کی تو پتہ لگا کہ ندامت کے تین پہلو ہیں۔ گہری ندامت، خاصی ندامت، ہلکی ندامت یہ تینوں واقعاتی ہیں۔ احساسِ ندامت، ندامت کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اس کا تعلق نفسیات سے ہے۔ سخت مزاج، اکھڑ، لاپروا، منہ پھٹ، چالاک، نڈر اور بے حیا شخص پر ندامت کا اثر کم ہوتا ہے۔ نازک طبع، کم گو، شریف اور کمزور انسان پر اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور بے قصور انسان پر اس کا اثر گہرا ہوتا ہے۔

گہری ندامت کا احساس ہوتے ہی جسم اینٹھ جاتا ہے۔ گردن بالکل جھک جاتی ہے۔ جسم پانی پانی ہو جاتا ہے۔ سوچ اور فکر میں انسان ڈوب جاتا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگ جاتی ہیں۔ پاگل پن سوار ہو سکتا ہے۔ خودکشی کی نوبت آسکتی ہے۔

عدالتیں، پنچایتیں جب کسی ملزم کو مجرم قرار دے کر کٹہرے میں سزا سناتی ہیں تو مجرم کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اگر وہ بے قصور ہو تو ندامت کا احساس اسے عمر بھر نہیں چھوڑتا۔ کسی باعزت شہری کو بلا قصور بلکہ دانستہ ہتھکڑی لگا کر بازاروں سے عدالت کے کٹہرے تک لے جایا جائے تو وہ شخص خود کو زندہ درگور محسوس کرتا ہے اور باعزت

بری ہو جانے پر بھی اُسے ندامت کا احساس کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور اگر پنچایت یا عدالت کو کسی بے قصور کو غلط طور پر سزا دیے جانے کا پتہ لگ جائے تو منصف کو ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تو منصف اپنی اس غلطی پر اتنا نادم ہوتا ہے کہ ملازمت سے استعفیٰ دے دیتا ہے حالانکہ منصف نے بدنیتی سے فیصلہ نہیں کیا ہوتا۔ احساسِ ندامت ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔

گہری ندامت زندگی کو تیرہ و تار بنا دیتی ہے۔ انسان کے مستقبل سے کامیابی و کامرانی کی ایک ایک کرن کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ زندگی ویران بن جاتی ہے۔ انسان اندر سے کھوکھلا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

گہری ندامت کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا۔ خاصی ندامت کا اثر بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔ ہلکی ندامت کا اثر کچھ دیر کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

ایک مثال دیکھیے۔ پڑوس میں ایک عالی شان بنگلہ ہے۔ ہر طرح کا آرام وہاں میسر ہے۔ نوکر چاکر ہیں۔ موٹر گاڑیاں ہیں۔ ایک متوسط گھرانا بھی نزدیک ہے۔ نہایت ایماندارانہ زندگی بسر کرنے اور بہت محنت کرنے کے بعد بھی مشکل سے گزر ہوتا ہے۔ اس گھر کا کوئی بچہ کسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے اور بنگلہ میں رہنے والے بچے کے پاس اس چیز کے ہونے کا ذکر کرتا ہے تو اس ایماندار شخص کے دل میں احساسِ جرم پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ بیوی بچوں کی نظر میں ایک مجرم سا بنا رہتا ہے۔ احساسِ کمتری کا حملہ ہو تو ندامت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ احساسِ جرم، احساسِ کمتری، احساسِ ندامت تینوں مل جائیں تو روح کو کچلنے کے لیے کافی ہیں۔ اس لیے سمجھدار لوگ ان لوازمات سے بے نیاز ہو کر اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور جو انھیں مل جاتا ہے، صبر و شکر سے گزارہ کرتے ہیں۔

احساسِ جرم مذہبی پیشواؤں کے فرمانوں سے اور بھی خطرناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ احساسِ جرم دوزخ کی آگ کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ آخر میں ندامت کے گڑھے میں غرق ہو جاتا ہے۔

ایک ملازم اپنے مالک سے دھوکا کرتا ہے۔ ہزاروں روپے بے ایمانی سے ادھر اُدھر کر دیتا ہے۔ پھر عیش و عشرت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ راتوں کو اسے نیند نہیں آتی۔ غم غلط کرنے کے لیے شراب کا سہارا لیتا ہے۔ ناچ گانے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی صحت برباد کر لیتا ہے۔ اسے اپنے جرم کا احساس ہے۔ ندامت کا احساس اسے اپنے مالک کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے نہیں دیتا۔ اسے اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔

بچوں کی تربیت کا خاص انتظام ہونا ضروری ہے۔ مگر بدقسمتی سے تربیت دینے والے خود ہی حقیقتوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ تربیت کے انداز اب بھی وہی ہیں۔ اسکول میں بچوں کی بیدوں سے مرمت اور گھر میں بات بات پر جھڑکنا، سزا دینا، اور شرمندہ کرنا۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لڑکیاں تو کانپنے لگ جاتی ہیں۔ راتوں کو بڑبڑانے لگتی ہیں۔ بات بات پر ندامت محسوس کرتی ہیں۔ ڈری ڈری رہتی ہیں۔ انھیں ایک خوف ستاتا رہتا

ہے کہ دوسرے کیا کہیں گے۔ بچے اپنے دوستوں سے ملنے سے کترانے لگتے ہیں۔ ایک معمولی واقعہ لاشعور میں پہنچتا ہے۔ ندامت کے بوجھ کے تلے بچہ دبا رہتا ہے۔

بزنس میں گھاٹا آنے، آرام و آسائش چھن جانے سے بھی انسان کو ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی ساکھ قائم نہیں رہتی۔ وہ دوسروں کی نظروں میں گر جاتا ہے۔

کچھ لوگ قرض لینے کے عادی ہوتے ہیں اور واپس کرنا بھی نہیں چاہتے۔ چنانچہ قرض دینے والا جب اپنی رقم مانگتا ہے۔ "تو وقت پر رقم نہ دینے کے لیے نادم ہوں" - کہہ کر بات ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ناواقفیت میں یا بچپن میں کوئی جنسی بے راہروی کا کام ہو جائے تو وہ واقعہ ہمیشہ ندامت کا احساس لاتا رہتا ہے۔ شیخی یا بڑ مارنے والے کے تحت الشعور میں ندامت کا احساس ہوتا ہے۔

بعض دفعہ ندامت کے احساس سے قوتِ عمل کی نئی دھاریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ بے معنی زندگی با معنی بن جاتی ہے۔ ویران زندگی پھر سے آباد ہونے لگتی ہے۔ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ ندامت کا احساس وہ کام نکلوا لیتا ہے جو عام حالت میں نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے لیڈر سخت مقابلوں میں۔ الیکشنوں میں ہار جاتے ہیں۔ بے حد نادم ہوتے ہیں۔ یہ احساسِ ندامت انھیں جھنجھوڑتا ہے۔ وہ پھر اُٹھتے ہیں اور میدان مار لیتے ہیں۔

ایک ہلکا اور لطیف واقعہ بھی ندامت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایک طبعاً ظریف شخص اپنے ایک دوست کو جو ایک اعلیٰ افسر تھا ملنے گیا۔ باہر چپراسی بیٹھا تھا۔ اسے کہا کہ جاؤ افسر کو بتاؤ کہ ایک شخص ملنے آیا ہے۔ چپراسی نے نام و پتہ پوچھا لیکن اس نے رعب داب سے اسے اندر بھیج ہی دیا۔ افسر نے نام کا پتہ لانے کی ہدایت کی تب اس ظریف شخص نے اپنا وہ نام بتایا جو افسر کے والد کا نام تھا۔ افسر سمجھ گیا کہ کوئی لنگوٹیا یار ہے۔ باہر آیا۔ گلے ملا۔ ندامت دونوں کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

مُلک کی تقسیم سے پہلے ریاستیں خود مختار تھیں لیکن حکومت کی باگ ڈور گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ایک جہاں دیدہ بزرگ ایک مہاراجہ کے پاس گیا اور کہا کہ وہ اپنی تکلیف تب بیان کرے گا اگر سے یقین دلا دیا جائے کہ مہاراجہ کو فیصلہ کرنے کا خود اختیار ہے۔ مہاراجہ نے رعب سے کہا "ہم فیصلہ کریں گے"۔ جب بزرگ اپنی داستان سنا چکا تو مہاراجہ نے کہا کہ "ہم کیا کر سکتے ہیں"۔ تب بزرگ نے کہا کہ یہ بات تو اس نے پہلے ہی کہہ دی تھی کہ مہاراجہ کچھ نہیں کر سکتے۔ مہاراجہ یہ بات سُن کر بہت نادم ہوا - اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

شاعروں، مشاعروں کی دنیا میں چلیے۔ ایک شاعر اپنا کلام سُنانے کے لیے اُٹھے۔ پہلا شعر پیش کیا۔ حاضرین نے بھانپ لیا۔ مال مسروقہ ہے۔ دوسرا شعر ابھی ادھورا تھا کہ کسی نے اُٹھ کر مکمل کر دیا۔ شاعر سمجھ گیا کہ چوری پکڑی گئی۔ تھا چالاک۔ ندامت کا اثر چہرے پر آنے نہ دیا۔ حالت غیر تب ہوئی جب کسی نے اٹھ کر کہا "حضرت

یہ غزل کتنے میں خریدی ؟"

ایک مشاعرے میں ایک نئے شاعر کو دعوت سخن دی گئی۔ ڈائس پر پہنچے۔ غزل شروع کی۔ کلام میں زور ڈالنے کے لیے قدم اُٹھایا تو دھڑام سے گرے۔ محفل قہقہہ زار ہوئی۔ شاعر کو ندامت ہوئی۔ پھر اُٹھے۔ آنکھیں بند کیں۔ دایاں ہاتھ اُٹھا۔ صدر محفل کی ناک پر پڑا۔ اُدھر نکسیر پھوٹی اُدھر اشعار کا فوارہ پھوٹا۔ صدر محفل معنی خیز ندامت کو رومال سے چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ ناظم مشاعرہ نے روکا۔ پھر ٹوکا۔ آخر یہ کہہ کر بیٹھ گئے۔" استاد ٹھیک کہتے تھے۔ اچھے شعر کی پرکھ صرف انھیں ہی ہے۔"

ایک مشہور فارسی شاعر انوری کا کلام ایک شاعر جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے اور لوگوں سے بے پناہ داد لے رہے تھے۔ انوری بھی وہاں پہنچ گئے۔ کچھ دیر تو خموشی سے سُنتے رہے۔ نہ رہا گیا تو پوچھ بیٹھے کہ یہ کلام کس کا ہے۔ جواب ملا" انوری کا" پوچھا گیا" انوری کہاں ہیں"۔ جواب ملا۔"وہ ہم ہی تو ہیں"۔ ایک صاحب جو انوری کو جانتے تھے بول اُٹھے کہ" انوری صاحب آپ جتنے عظیم شاعر ہیں اتنے ہی حلیم بھی ہیں"۔ اندازہ آپ کرلیں اس ندامت کا جس میں شاعر غرق تھا۔

ایک مقرر نے ایک بھاری مجمع میں تقریر شروع کی۔ تقریر طویل اور بے معنی تھی۔ انداز بیان بھی پُر اثر نہ تھا۔ سامعین سُننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مقرر ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ہوٹنگ شروع ہوئی۔ نہ مقرر رُکے نہ ہوٹنگ۔ آخر ہوٹنگ اور شوٹنگ نے مُقرر کو بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ جس ندامت میں مقرر غرق تھے وہ تو سامعین دیکھ ہی رہے تھے لیکن ناظم مشاعرہ کی حالت تو موت سے بدتر تھی۔ وہ اپنی غلطی پر بے حد نادم تھے۔

اپنا نام اُچھالنے اور دوسروں کی پگڑی اُچھالنے والوں کو بعض دفعہ منہ کی کھانی پڑتی ہے اور وہ ندامت کے مارے سر نہیں اُٹھا سکتے۔ اسی لیے سوجھ بوجھ والے لوگ ایسا کوئی فعل نہیں کرتے جس سے ندامت اُٹھانی پڑے۔

آم کے آم گُٹھلیوں کے دَام

آم کے آم گٹھلیوں کے دام ایک ضرب المثل ہے۔ یہ مثل کس دن، کس وقت، کس تاریخ کو وجود میں آئی؟ اس کا محلِ وقوع کیا ہے؟ یہ کسی آم کے بیوپاری کی ایجاد ہے یا کسی آم کے رسیا کی۔ اس کہاوت کے پیدا کرنے میں کس کس کا ہاتھ ہے؟ اسے پیدا کرنے کا مدعا کیا ہے؟ اس کا ارتقا کیسے ہوا کہ زبان زد ہوگیا؟ آئندہ ترقی کے کیا کیا امکانات ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہم نے سب سے پہلے لغت کا سہارا لیا۔ شاید ہی دُنیا کی کوئی لغت ہو جو ہمارے پاس نہ ہو۔ اور شاید ہی کوئی لغت ہو جو ہم نے چھان پھٹک کر نہ دیکھی ہو۔ لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔ علماء سے ملے، ڈاکٹروں سے ملے، اِدھر اُدھر کی باتیں تو وہ سُناتے رہے لیکن جواب نہ ملا۔ کچھ نے فرمائش کی۔ کچھ نے فہمائش کی کہ جب ریسرچ مکمل ہو جائے تو نتیجہ بتانا۔ اتنا پتہ ہمیں تھا کہ آم میں گُٹھلی چھپی ہوتی ہے اور گُٹھلی میں آم۔

سب سے پہلے ہم نے آم کے بیوپاریوں کی طرف رجوع کیا۔ ملیح آباد کا نام ہم نے سن رکھا تھا۔ وہاں آموں کے باغات ہیں، یہ بھی پڑھ رکھا تھا۔ یہ بھی پتہ تھا کہ حضرتِ جوش جہاں اپنی شاعری کے لیے مشہور ہیں وہاں ملیح آباد کے آموں کے باغات کی وجہ سے بھی جانے جاتے ہیں۔ بلکہ ہم نے تو یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ پنڈت ہری چند اختر انھیں اپنے مخصوص انداز میں ملیح آباد کا ہیڈ مالی بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ہیڈ مالی، باغات ملیح آباد کے مختصر پتے پر مفصل خط لکھا تاکہ مثل کی وجہ تسمیہ کا پتہ مل جائے۔ خط ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ جواب بھی ملا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارا کام بن گیا۔ اس وقت ہماری خوشی کا یہ عالم تھا کہ ہمیں وہ چھت جس کے نیچے ہم بیٹھے تھے جھومتی نظر آرہی تھی۔ بہرحال سنبھلے، خط پڑھا

جواب صرف ایک سطر میں تھا۔ کیا تھا وہ آپ بھی سُن لیجیے۔ لکھا تھا۔ "میاں ہم آم بیچتے ہیں، کہاوتیں نہیں۔" بھلا ہم میدان سے بھاگنے والے کہاں۔ پریس کے ایک نمائندہ کے پاس جاکر اپنی تکلیف بیان کی۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے۔ "کل ایک کلچرل ٹروپ آرہا ہے۔ فلاں تھیٹر میں شام کو پہنچ جانا۔ تمھیں جواب مل جائے گا۔" بڑے کرب سے وقت گزارا اور ٹھیک وقت پر تھیٹر پہنچے۔ دس روپے کا ٹکٹ لیا اور نمائندہ صاحب کو ڈھونڈنے لگے۔ وہ تو نہیں ملے البتہ پریس گیلری مل گئی۔ مڑکر دیکھا تو نمائندہ صاحب اپنی بیوی اور نصف درجن بچوں کے ساتھ تشریف لارہے تھے۔ انھیں دیکھ کر اور پاکر ہماری باچھیں کھِل گئیں، ملتے ہی اپنا سوال دہرایا۔ جواب ملا۔ "انٹرول کے وقت یہیں رہنا اور ہر بات کا جائزہ لینا۔ اختتام شو کے بعد مجھے پھر ملنا۔" لوگ ناچ دیکھ رہے تھے۔ گانا سُن رہے تھے۔ تالیاں پیٹ رہے تھے۔ جھوم رہے تھے۔ ہماری نظریں اور کان بھی ادھر تھے۔ مگر ہم انتظار کر رہے تھے انٹرول کا۔ انٹرول میں ہم وہاں سب جائزہ لیتے رہے۔ شو پھر شروع ہوا۔ ختم ہونے پر ہم نمائندہ صاحب کی طرف لپکے۔ انھوں نے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "دیکھو میاں گاڑی ہم کو لے کر آئی۔ اب ہمیں گھر چھوڑ کر آئے گی۔ شو کا پاس پوری فیملی کا گھر پہنچا۔ شو مفت دیکھا۔ عزت الگ ملی۔ لذت الگ۔ اسے کہتے ہیں "آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔" سرا ہمارے ہاتھ میں آچکا تھا۔ ہم نے اپنی ریسرچ جاری رکھی۔ اچانک ہمیں ایک پروفیسر صاحب کا خیال آیا جو سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھاتے تھے اور کتب پر تبصرے بھی لکھتے تھے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ شاید ان سے کچھ سراغ ملے۔ ان سے ملنے چلے گئے۔ معلوم ہوا ٹیوشن پڑھا رہے ہیں۔ رات نو بجے کے قریب ہی مل سکیں گے۔ اب کون گھر واپس جاتا اور پھر پلٹتا۔ چنانچہ ہم ادھر اُدھر گھوم آئے اور یہ سوچ کر کہ نو بجے کا وقت نہ ٹل جائے مکان کے باہر دھونی لگا دی۔ وقت پر دستک دی۔ ایک کرخت آواز آئی۔ "کون ہے۔" ہم نے کہا۔ "ایک طالب علم۔" اتنا سُننا تھا کہ دروازہ کھڑاک سے کھُلا۔ شاید پروفیسر صاحب نے سوچا کہ ایک ٹیوشن اور ہاتھ آئی۔ لیکن ایک بڈھے کھوسٹ کو سامنے دیکھ کر کہا۔ "میاں کیا کام ہے۔" ہم نے فوراً کہا۔ "ایک کہاوت کا مطلب سمجھنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔" غالباً انھوں نے کسی بھی موضوع پر ریسرچ نہیں کی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ریسرچ کے بندے ان سے مدد لینے کے لیے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ انھوں نے پہلے ہمیں چائے پلائی۔ پھر ہم سے سوال کیا۔ "آپ کو تکلیف کیا ہے ؟" ہم نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اسی اثنا میں ہماری نظر میز پر رکھی کتابوں پر گئی۔ پاس ہی ایک کتاب کھلی ہم دیکھ چکے تھے جس پر پروفیسر صاحب تبصرہ لکھ رہے تھے یہاں بھی سرا ہمارے ہاتھ آچکا تھا۔ ہم نے یہ سوال بھی داغ دیا۔ "سُنا ہے آپ تبصرے لکھتے ہیں۔ آپ کو اس سے کیا ملتا ہے۔" جواب ملا۔ "معاوضہ"۔ "اور . . ." ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ "کتاب بھی تو ملتی ہوگی۔" کہنے لگے "ہاں"۔ ہم نے کہا۔ "پھر تو جواب مل گیا۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام"۔ پروفیسر صاحب پہلے کچھ جھینپے۔ پھر سٹپٹائے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ ریسرچ اس طرح کی جاتی ہے۔ ہمارا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی اور ریسرچ کے بعد ہم اپنا تھیسس مکمل کرنے کی اُمید لیے رہے۔ اتفاقیہ ہم اپنے ایک دوست شاعر کے گھر پہنچے۔ وہاں ایک صاحب بھی بیٹھے تھے۔ ہمارا تعارف

کرایا گیا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہ صاحب بھی شاعری کرتے ہیں۔ ہم نے کلام سُنانے کی درخواست کی۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نو واردان کے شاگرد ہیں۔ غزل شروع ہوئی۔ شعر ہیں تو کیا ہر مصرع میں ان کے استاد کا رنگ تھا۔ آخر ایک شعر میں انھوں نے ایک لفظ اس طرح پڑھا کہ بندھا تو صحیح تھا لیکن تلفظ غلط تھا۔

"پھر پڑھیے"

"انھوں نے پھر پڑھا۔ پھر تلفظ غلط"

"دوبارہ ذرا سوچ کر احتیاط سے پڑھیے۔"

استاد شاعر بھانپ گئے اور بھانڈا پھوٹنے کے ڈر سے شاگرد کو کہنے لگے۔ "ابھی ٹھہرو۔ ہم کچھ ضروری باتیں کریں گے اور پھر سُنیں گے۔"

ہم نے استاد شاعر کو کسی کتاب کو ڈھونڈنے کے کام میں لگا دیا اور لپک کر شاگرد کی بیاض کو دیکھنے، پڑھنے اور سونگھنے کو پہنچ گئے۔ دیکھا تو سبھی اشعار ہندی میں لکھے ہوئے تھے۔ استاد شاعر سب نظارہ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے شاگرد کو چلتا کیا۔

ہم نے پوچھا۔ "یہ تو غزل مکمل آپ نے لکھ کر دی ہے۔ اور وہ لفظ . . . آپ کو تو معقول معاوضہ پرچے دیتے ہیں۔ پھر یہ حرکت کیوں۔ آپ تو ادب پر ظلم کر رہے ہیں۔"

"ہاں میاں کوئی رسالہ پچاس روپے سے زائد نہیں دیتا۔ میری آمدنی کا ذریعہ یہی ہے۔ چالیس روپے نقد انھوں نے دے دیئے۔ مشاعروں میں سُنائیں گے۔ جملہ حقوق میرے پاس محفوظ ہیں۔ مَیں مناسب تبدیلی کر کے اور مقطع بدل کر چھپوا دوں گا" ہم نے کہا تو یوں کہیئے۔ "آم کے آم گٹھلیوں کے دام" ایک قہقہہ پھوٹا۔

ایک واقعہ سنیئے نسیم ممتاز سعید رقمطراز ہیں کہ وہ اور شوکت تھانوی دیال سنگھ کالج لاہور کے دروازے کے پاس ایک آئس کریم بنانے والے سے آئس کریم لے کر کھایا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک روز آئس کریم والے سے کہا "بھئی آم کی آئس کریم کیوں نہیں بناتے۔ لیکن وہ ٹالتا رہا۔ غالباً اس لیے کہ آموں کا سیزن شروع نہیں ہوا تھا اور وہ خاصے مہنگے تھے۔ ایک دن آئس کریم کھا کر واقعی بہت لطف آیا۔ اس سے پوچھا کہ اس میں خاص بات کیا ہے"۔ بولا "آج میں نے اس میں بہت سے آم گیرے ہیں"۔ مطلب یہ کہ ڈالے یا گرائے ہیں۔ شوکت صاحب برجستہ بولے "نظامی صاحب! آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کی مثل کا مفہوم دراصل آج سمجھ میں آیا"۔ شوکت صاحب کو اس کا گیرے بہت پسند آیا اور سچ پوچھیے تو آئس کریم سے زیادہ وہ اس اصطلاح سے لطف اندوز ہوئے۔

تقریر کرنا

ایک وہ ہیں جو کسی تقریر کا موضوع ملنے پر کتابیں کھنگالتے ہیں۔ موضوع سے متعلق مسالہ حاصل کرتے ہیں۔ پھر اس میں کمی بیشی، ردّ و بدل کرتے ہیں۔ کچھ اپنا مال ملاتے ہیں تاکہ مال مسروقہ نہ کہلائے۔ ایک وہ ہیں جو مضمون لکھوا لیتے ہیں۔ پھر رٹ لیتے ہیں تاکہ یہ پتہ نہ چلے کہ تقریر کسی اور کی لکھی ہوئی ہے۔ ایک وہ ہیں جو خود تقریر تیار کرتے ہیں۔ ان کی تقریر سے تقریریں تیار ہوتی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن سے جب چاہو تقریر کرا لو۔ وہ پیشہ ور مقرر ہوتے ہیں۔ اپنی چرب زبانی سے کام نکالتے ہیں اور موضوع کا تو پانی پانی کر دیتے ہیں۔

نپولین نے کہا تھا: ——

"جنگ کا فن ایک سائنس ہے، جس میں کوئی بات ایسی کامیاب نہیں ہو سکتی جسے پہلے سے نہ سوچا گیا ہو۔"

یہ بات فنِ تقریر پر بھی صادق آتی ہے۔ تقریر کرنا بہت مشکل کام ہے۔ فنِ تقریر کی صلاحیت کسی کو بھی معاشرے میں اہم اور نامور بنا سکتی ہے۔

مارک ٹوئن جب پہلی بار لیکچر دینے کے لیے کھڑا ہوا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ میں روئی ٹھونس دی ہو۔ گرانٹ نے وکس برگ فتح کیا لیکن جب پہلی مرتبہ لوگوں کے سامنے تقریر کرنے

آیا تو وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لینن کا بھی شروع میں یہی حال تھا۔

تقریر کرنے والا ایک ہوتا ہے۔ سامعین سینکڑوں، ہزاروں، ان سب کی نظریں مقرر کے چہرے، لباس اور اس کی حرکات و سکنات پر ہوتی ہیں۔ کان مقرر کی زبان کی شستگی، تلفظ انداز بیان اور مضمون پر ہوتے ہیں۔ پھر ہر سننے والے کا اپنا مزاج، اپنا موڈ، اپنا نظریہ، پرکھنے اور جانچنے کا پیمانہ الگ ہوتا ہے۔ چنانچہ چست اور ہوشیار مقرر دیدہ زیب لباس میں ملبوس نپے تلے قدموں سے سادگی، متانت اور خود اعتمادی کے ساتھ اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتا ہے اور مائک پر پہنچتے تک ایک نظر اسٹیج پر بیٹھے لوگوں پر اور دوسری نظر سامنے بیٹھے لوگوں پر یعنی اچٹتی نظر ڈال دیتا ہے۔ اور اندازہ کر لیتا ہے کہ سننے والوں کی قسمیں کتنی ہیں۔

ایک وہ ہیں جو اپنی صلاحیت سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ کسی قسم کی شعبدہ بازی، بیترے بازی وسیلے بازی سے سخت پرہیز کرتے ہیں۔ اپنی تقریر شروع ہی اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں اور پھر حسین الفاظ، برجستہ فقرے، شوخ و شگفتہ جملے ادا کرتے، خوبصورت ترکیبوں سے نفس مضمون کو آراستہ کرتے اور غنائیت سے بھرپور لہجہ اختیار کرتے ہوئے ترنّم اور موسیقیت پیدا کر دیتے ہیں۔ حسنِ بیان کی رعنائی سے فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی سے، خیالات کی دلنشیں ہم آہنگی اور ڈرامائی انداز سے سامعین کے دلوں میں ہلچل اور ہماہمی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ جوش و امنگ، ولولہ و ترنگ، رنگینی و رنگا رنگی، مستی و سرشاری، حلاوت اور سحر کے ساتھ وہ محفل پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ خوشی کے مارے آنسو چھلک پڑتے ہیں اور کبھی سوز و گداز۔ درد و غم، رنج و الم اس طرح پھوٹتا ہے کہ غم میں ڈوب کر آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ان کی ہر بات میں حکمت، ہر لفظ میں حرمتِ معنی اور ہر جملے میں خوشگوار فضا ہوتی ہے۔ کبھی برموقع کسی مستند شاعر کے شعر سے متبسم کرتے اور کبھی نشتر انگیزی اور جدت طرازی سے سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کی تقریر میں نہ طوالت ہوتی ہے نہ معذرت، نہ خودنمائی نہ خودستائی۔ انھیں اپنی بات میں دلچسپی پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے اور دلچسپی متعدی مرض ہے، جلد ہی سامعین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تقریر کو نقطۂ عروج پر لا کر اور اختتام سے پہلے وہ اہم بات کو دہرا کر بات اس طرح ختم کرتے ہیں کہ سامعین بھونچکے رہ جاتے ہیں اور پھر بے ساختہ مرحبا مرحبا کہہ اُٹھتے ہیں۔

ایک وہ ہیں جو ادھر دیکھتے ہیں نہ اُدھر۔ ادھر مائک پر پہنچے، ادھر تقریر شروع۔ وہ سامعین کی نبض کو پہچانتے ہیں۔ وہ بھی بات اس پیرایہ میں شروع کرتے ہیں کہ محفل بے قرار ہو جاتی ہے۔ پھر

کچھ ہی لمحے میں الفاظ گونجتے، گرجتے، برستے، ناچتے، تھرکتے، وجد کرتے نظر آتے ہیں۔ سامعین ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی تقریر سلگتی ہوئی آگ، بھڑکتا ہوا شعلہ، امنڈتا ہوا سیلاب، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج بن جاتی ہے۔ زبان اور بیان پر انھیں قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اسلوب میں تڑپ اور چمک ہوتی ہے۔ وہ رُکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ سننے والے نفسِ مضمون سے زیادہ ان کے لب ولہجہ، فصیح البیانی اور طلاقتِ لسانی کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ ابھی بات چل رہی ہوتی ہے کہ بیٹھ جاتے ہیں اور حاضرین کو حسرت ہوتی ہے "وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی"۔

ایک وہ ہیں جو کامیابی کے لیے ہر وسیلہ اختیار کرتے ہیں۔ سامعین میں ان کے بندے تشریف فرما ہوتے ہیں۔ کوئی یہاں کوئی وہاں، ان کا کام مُقرّر کی تقریر کے دَوران وقفے وقفے سے واہ وا کہنا ہوتا ہے۔ مُقرّر بات شروع کرتا ہے۔ بات سے بات پیدا کرتا ہے۔ مدبّرین کے حوالے دے کر اپنی بات میں وزن پیدا کرتا ہے۔ پھر برمحل اور موقعہ کی مناسبت سے اپنا شعر پیش کرتا ہے۔ ابھی شعر ختم نہیں ہوتا کہ مکرر مکرر کی صدا بلند ہوتی ہے۔ مُقرّر کبھی اِدھر دیکھتا ہے، کبھی اُدھر دیکھتا ہے، مسکراتا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے کہتے ہیں واقعیت ومعنویت، نُدرت وجدّت، لطف واثر، بات وہ بھی پتے کی کہتے ہیں مطالعہ ان کا وسیع ہوتا ہے۔ سامعین کی نبض کو پہچانتے ہیں۔ لیکن ان کی کامیابی میں ان کے اپنے بندوں کا ہاتھ بھی ہوتا ہے جو موقعہ پڑنے پر مقرر کے کسی مخالف کو ہوٹ کرنے کا کارنامہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔

ایک وہ ہیں جو کوئی نرم ونازک موضوع خود پر لا دیتے ہیں۔ مثلاً کسی مُقرّر کے دل میں یہ احساس چٹکیاں لیتا ہے کہ یہ طنز ومزاح کے بندے پورے ماحول کو اپنے بس میں کر لیتے ہیں اور سامعین ہیں کہ انھیں بار بار سنتے ہیں، تو وہ بھی کوئی مزاحیہ خاکہ یا طنزیہ سُنانے کا اہتمام کر لیتے ہیں اور طنز ومزاح کی کسی خاص محفل میں سُناتے ہیں۔ طنز ومزاح میں لکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طنز ومزاح نگار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ طنز ومزاح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان کی چاشنی ہو۔ فقروں کی بندش لطیف ہو۔ الفاظ کی مخصوص حسین ودلکش ترتیب وتنظیم ہو۔ ماحول کی تصویر کشی تخلیقی رابطہ پیدا کرے۔ لچک اور نزاکت ہو، شوخی وشرارت ہو۔ کیف وسُرور، حلاوت وسحر کے چشمے پھوٹ رہے ہوں۔ مزاح متنوع اور زنگا رنگ ہو۔ طنزیہ ہو تو خود پر بھی ایک آدھ چھینٹا طنز کا گرائے۔ الفاظ سے ایسا جادو جگائے کہ محفل متبسّم ہو جائے۔ پھر ہنسی لانے کی کیفیت پیدا کرے اور نقطۂ عروج پر پہنچنے سے پہلے ایسا ماحول پیدا کر دے کہ قہقہے پھوٹتے نظر آئیں۔ اگر شروع میں ہی رنگینی پیدا نہ ہو جائے تو سامعین مُقرّر کو سننے سے انکار کر دیتے ہیں اور اسٹیج پر سے ہٹانے کے لیے تالیاں بجاتے ہیں۔ مُقرّر پھر بھی نہ ہٹے تو تالیوں کی

اتنی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے کہ مُقرّر کو مجبوراً ہٹنا پڑتا ہے۔ مُقرّر خود تو پِٹتا ہی ہے۔ محفل برباد ہو جاتی ہے منتظمین نادم ہوتے ہیں۔ مقرّر تو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

تقریر صرف اس شخص کو کرنی چاہیے جو علم و فضل، ذہن و ذکاوت، تیزی و طبّاعی، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی، تلاش و تجسّس کی ایک دُنیا اپنے اندر سمیٹے بیٹھا ہو۔ بہت بار سامعین میں سے کوئی شخص محض لطف لینے کے لیے کوئی فقرہ چسُت کرتا ہے۔ اب اگر مُقرّر ہوشیار ہوتا ہے تو وہ ایسا لطیف جواب دیتا ہے کہ محفل لالہ زار ہو جاتی ہے۔ لوگ ایسے مقرّر کو سُننے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔

حضرات تقریر اور مقرّر کی قسمیں کچھ آج گنوا دی ہیں۔ باقی پھر سہی۔

میری تعریف کرو

یہ بات اُس وقت کی ہے جب ہم بچے تھے۔ وَیسے بچے تو ہم اَب بھی ہیں لیکن اس وقت تو ہم حقیقتاً بچے تھے کہ ہمارے کانوں میں بھنک پڑی۔ "تعریف اُس خُدا کی جس نے جہاں بنایا"۔ جیسے اور بہت باتیں ہم سُن کر اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ یہ بات بھی اسی لپیٹ میں آگئی۔ اسکول پہنچے۔ ہر صبح باقاعدگی سے لائن حاضر ہوتے۔ ساتھی طلبا کے ساتھ ترنّم سے اور لہک لہک کر ایک نظم ہر صبح پڑھتے، جس کا پہلا مصرعہ یہی ہوتا تھا۔ یقین جانیے ہمیں اس وقت کسی نے خُدا کا مطلب نہیں بتایا اور نہ یہ تشریح کی کہ خدا کی تعریف کیوں کی جائے۔ ایک روز، کرنا خدا کا کیا ہوا، کہ ہمارے تجسّس نے زور پکڑا اور ہم اپنے استاد سے پوچھ بیٹھے کہ خُدا کون ہے۔ کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، اور اس کی تعریف کیوں کی جائے۔ جو بھی جواب اس وقت استاد سے ملا، اس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوگیا کہ ہمارے استاد خدا کو جانتے تک نہ تھے، نہ ان کی کبھی ملاقات ہوئی تھی۔ جو کچھ انھیں پتہ تھا وہ سب سُن کر یا پڑھ کر ہی انھوں نے حاصل کیا تھا اور وہی انھوں نے ہمیں بتا دیا۔ ہم نے معاملہ کی چھان بین کی، اور بڑے بڑے مُلاؤں اور پنڈتوں کے پاس پہنچے، تب پتہ چلا کہ یہ بات تو آسمانی صحیفوں میں کہی گئی ہے کہ خدا کی تعریف کی جائے یعنی خدا نے خود ہی اپنی تعریف کرانے کا سلسلہ بنایا۔ گہرائی میں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ بہت لوگوں نے تو اپنی پوری زندگی خُدا کی تعریف کرنے اور لوگوں سے تعریف کرانے میں گزار دی۔ انھوں نے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔

بڑے بڑے بادشاہ تخت پر بیٹھتے۔ لوگ انھیں ظل اللہ کہتے۔ نعمتِ خداوندی بتاتے اور تعریف کے پل باندھتے۔ بادشاہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتے اور انعام دیتے۔ چنانچہ بادشاہ کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی جاتی اور جو شخص تعریف کرنے میں سب سے بازی لے جاتا وہ بادشاہ کے نزدیک ہو جاتا۔ شعراء قصیدے کہنے لگے۔ جو شاعر سب سے عمدہ قصیدہ کہتا یا سب سے زیادہ بادشاہ کی تعریف کرتا وہ سب سے زیادہ انعام پاتا۔ دوسرے شعراء حسد کرنے لگ جاتے۔ اشعار میں خامیاں ڈھونڈتے اور بادشاہ کو بتاتے۔ مخالف کی مذمت کرتے اور اپنی تعریف کرتے۔ شاعروں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ اور چپقلش شروع ہو گئی۔ معرکے ہونے لگے۔ استادوں کی حمایت میں شاگرد میدان میں کود پڑتے۔ جلسے ہوتے۔ جلوس نکلتے۔ انشا و عظیم، انشا و فایق، انشا و قتیل و انشا و راغب، جرأت و نو، ناسخ و آتش، سودا اور مرزا جانِ جاناں، سودا اور مرزا فاخر، سودا اور میر ضاحک، سودا اور مکیں، انیس و دبیر، نصیر و ذوق، غالب اور ذوق وغیرہ کے ادبی معرکے کیا تھے۔ یہی نہ کہ اپنی تعریف کی جاتی اور مخالف کو گرانے کی کوشش کی جاتی۔ چونکہ یہ لوگ صحیح معنوں میں شاعر ہوتے تھے اور زبان و بیان پر پوری گرفت ہوتی تھی۔ اس لیے جب بھی کوئی عمدہ شعر اپنے مخالف کا سنتے تو خوب تعریف کرتے تھے۔ مصنف "آبِ حیات" رقمطراز ہیں کہ سید انشاء نے ایک مشاعرہ میں ۵ اشعار کی ایک غزل پڑھی۔ اس کا ایک شعر تھا:

لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا
جگر کی آگ بجھے جلد جس سے وہ شے لا

اس مشاعرے میں جرأت اور مصحفی تک سب موجود تھے۔ مگر سب نے غزلیں اپنے ہاتھ سے رکھ دیں کہ اب پڑھنا لاحاصل ہے۔

ادب میں دلچسپی بڑھی تو ہم نے دیکھا کہ بہت جگہ شعراء نے اپنی کتاب خُدا کی حمد سے شروع کی، اور اس کے بعد اپنی تعریف پر اُتر آئے۔ بہت جگہ یہ عالم دیکھا کہ خُدا کا نام ہی نہیں یا اسے پسِ پشت ڈال دیا۔ جب ہماری نظر میر تقی میر کے اس شعر پر پہنچی:

ساری دُنیا پر ہُوں مَیں چھایا ہُوا
مُستند ہے میرا فرمایا ہُوا

تو ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ اور سچ مانیے، یہ کان آج تک اپنی جگہ پر نہیں لوٹے۔ ہم نے تو سُنا تھا کہ اپنی تعریف، تعریف نہیں کہلاتی۔ اور یہاں دُوسری بات ہی نہیں تھی۔ چنانچہ بھاگم بھاگ پھر استاد کے پاس پہنچے۔ انھوں نے وضاحت فرمائی کہ اسے تعلّی کہتے ہیں، اور شعرا اور ادبا کو اس کی اجازت ہے۔ ہم نے سوال کیا۔ "یہ اجازت انھیں کس نے دی؟" اس کا جواب جو استاد نے دیا وہ بھی ان کا سُنا سنایا تھا۔ آج کل ہم مختلف شعرا کے دیوان کھنگالنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ یہ دیکھیں کہ انھوں نے خدا کی تعریف میں کتنا کچھ کہا ہے، دُوسروں کی تعریف میں کتنا لکھا ہے اور اپنی تعریف میں کتنا، ابھی تک تو جو کچھ ہمارے مطالعہ سے گزرا ہے، اس کے مطابق تعلّی کا پلڑا بھاری ہے۔

آئیے آپ کو مشاعروں، مناظروں، سیمیناروں، جلسوں اور ادبی محفلوں کی دُنیا میں لے چلیں۔ یہ بات پہلے ہی مشاعرہ کی ہے۔ اس میں ایسے شعرا تھے جو جدید شاعری کے متوالے تھے اور قدیم شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو قدامت پسند تھے اور جدید شاعری کے مخالف۔ ان میں وہ بھی تھے جو قدیم اور جدید دونوں کے امتزاج سے اپنے اشعار میں ندرت پیدا کرتے تھے۔ مشاعرہ کے شروع میں ہم نے دیکھا کہ بعض بہت عمدہ اشعار پر خموشی رہتی اور بعض ناقص شعروں پر واہ وا، پھر کہنے "کیا شعر ہے، یہ آپ ہی کا حصہ ہے" کے نعرے بلند ہوتے۔ اب جو پتہ لیا تو معلوم ہوا کہ جیسے دنگل میں پہلوان اپنے حریف کو داؤ پیچ سے شکست دیتے ہیں اسی طرح کچھ شاعر اپنے مدّاح اپنے ساتھ لاتے ہیں، جو یہاں وہاں۔ اِدھر اُدھر محض اس لیے بیٹھتے ہیں کہ اپنے شاعر کی تحسین و آفریں کریں۔ مدبرین حیران رہتے ہیں لیکن کر کچھ بھی نہیں سکتے۔

آجکل تعریف کرانے کے لیے پانچ حربے زیادہ مستعمل ہیں:

(۱) مشاعرہ بازی (۲) رسم اجرا (۳) جشن بازی (۴) رسالوں کے نمبر یا گوشے۔ (۵) خاکہ نگاری۔

مشاعرہ بازی ایک فن ہے۔ کوئی چلتا پرزہ شاعر یا ادیب ایک انجمن بنا لیتا ہے۔ اچھا پیڈ، عمدہ لفافے لاتا ہے۔ اُردو کے نام پر سرکاری اداروں سے رقمیں لیتا ہے۔ اشتہارات اکٹھے کرتا ہے۔ اور پھر ایک سوونیر شایع کرتا ہے۔ اس میں اپنی تعریف، اپنے دوستوں کی تعریف میں مضامین چھپواتا ہے۔ اور دوستوں میں ان کا ذکر زیادہ ہوتا ہے جو خود مشاعرے باز ہیں اور امداد باہمی کے اصول پر اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ نہایت عمدہ کاغذ پر فوٹو چھپتے ہیں۔ ناظمِ مشاعرہ اگر چاہے تو کسی معمولی شاعر کو کامیاب کرا دے اور چاہے تو کسی مُستند شاعر کو ہوٹ کرا دے۔ اس لیے شعرا حضرات ناظم مشاعرہ کی طرف ملتجی نظروں سے

دیکھتے رہتے ہیں۔

رسمِ اجراء کسی شاعر یا ادیب کی کسی کتاب کی رُونمائی ہوتی ہے۔ اس میں مصنف بہت محنت سے شاعر اور ادیب اکٹھے کر کے لاتا ہے اور ان کا کام صرف تعریف کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کام مشاعرہ بازوں شعبدہ بازوں اور گروہ بازوں کو دے دیا جاتا ہے۔

جشن بازی ایک نیا مرض ہے۔ یہ بدعت اب عام ہوتی جا رہی ہے۔

کچھ رسالوں اور پرچوں نے شعراء اور ادباء کے ضخیم نمبر نکالنے شروع کیے ہیں۔ اسی طرح بہت سے رسالے اور پرچے گوشے نکالتے ہیں۔ ان میں ایسے مضامین بھی ہوتے ہیں جو متعلقہ شاعر یا ادیب نے خود ہی لکھ کر دیے ہوتے ہیں اور کسی اور کے نام سے چھپ جاتے ہیں۔ غرض ان کی بھی یہی ہوتی ہے کہ "میری تعریف کرو"۔۔۔۔

اگر کوئی شاعر یا ادیب صحیح معنوں میں تعریف کا حقدار ہے تو اس کا ذکر ہونا ضروری ہے اور فکر بھی۔ اس سے دُوسروں کو انسپریشن ملتی ہے۔

خاکہ نگاری بہت مشکل فن ہے۔ علماء نے اپنے دوستوں کے خاکے لکھے ہیں۔ ان کی خوبیاں اور نقائص بتائی ہیں۔ ہر شاعر اور ادیب اپنی تعریف چاہتا ہے۔ اگر نہیں تو ذکر چاہتا ہے، فکر چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسے شاعروں اور ادیبوں کو اگر کسی ایسے خاکہ نگار کا پتہ چل جاتا ہے جو تھوک میں خاکے لکھتا ہو تو وہ اس کی طرف لپکتے ہیں۔ پہلے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کا ذکر ہر جگہ کرتے ہیں تاکہ خاکہ نگار ان کا خاکہ لکھے۔ ان ہی کی تعریف کرے۔

قصّہ مختصر یہ کہ ہر شخص ایسا حربہ استعمال کرنے کے چکر میں ہے کہ اس کی تعریف ہو یعنی "میری تعریف کرو" ہو سکے تو ابھی اور اسی وقت۔ سانس کا کیا پتہ ہے۔ پھر آئے نہ آئے۔

رام لعل نابھوی

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

یہی ہے خاکہ نویس اور یہی ہے خاک نویس　　یہی ہے فحش نگار اور یہی ہے پاک نویس
یہی مزاح نویس اور طنز ناک نویس　　یہی ہے مدح نویس اور یہی ہے تاک نویس
زمانے والے اسے رام لعل کہتے ہیں

رہی نہ بزم نہ محفل نہ انجمن باقی!　　نہیں جہاں یہ مغ و بادہ نوش یا ساقی
نہ اس سے دوستی اس کی نہ اس سے ناچاقی!　　ہے لکھی ظاہر و باطن پہ اس کے بیباکی
درست ہے جو اسے رام لعل کہتے ہیں

ہر اک کو اس سے کدورت بھی ہے محبت بھی　　اسے پسند ہے رندی بھی اور شریعت بھی
فرنگی پن بھی ہے اس میں تو ہندوویت بھی　　ہے قدرے اس میں شرارت بھی کچھ شرافت بھی
تمام لوگ اسے رام لعل کہتے ہیں

مجھے خبر نہیں عالم ہے کہ یا عامل ہے　　یہ ناخدا ہے یہ کشتی ہے یا یہ ساحل ہے
ہزار نقصوں کے ہوتے ہوئے یہ کامل ہے　　مزاح و طنز سے کیا چیز اس کو حاصل ہے
ہو کچھ بھی لوگ اسے رام لعل کہتے ہیں

اسے تو شوق ہے دیوانہ بزم بازی کا　　نیاز مندی کا چسکہ ہے بے نیازی کا
یہ روپ بھرتا ہے قاتل کا گاہے غازی کا　　یہ رازداں بھی ہے محمودی و ایازی کا
عجب نہیں جو اسے رام لعل کہتے ہیں

ہر اک ادیب ہے طالب زر اور شہرت کا　　وہ جذبہ پالتا ہے رشک اور عداوت کا
اسے جنوں ہے کہ وہ کی قدر و قیمت کا　　ہے احترام اسے دوسروں کی وقعت کا
اسی لیے تو اسے رام لعل کہتے ہیں

رام لعل نابھوی

سرسوتی سرن کیف

یارب مرا عطا بکنی صد دو صد زباں — تا وصف رام لعل بخوبی کنم بیاں
طوفان تند و تیز کہ آئد و بگذرد — برق و شرار ساں نہ نہال استنے عیاں
لیلیٰ طریق جلوہ نما ایست جا بجا — مجنوں سرشت لحظہ بہ لحظہ رواں دواں
حیرانست عقل و دانش ازیں مردِ طرفہ رنگ — جسمِ نحیف دارد و قلب و جگر تواں
پیری زِ مو نمودہ و طفلی زِ جست و خیز — دل پر شباب و ہیچ نگوئیم پس ازاں
چوں دشمنی بہ کس نہ تواں کرد دائماً — او گاہ گاہ جنگ بیارد بہ دوستاں
محتاط پول سادہ خورش سادہ پوش است — اِلّا برائے علم و ادب حاتمِ زماں
گاہے بہ طرزِ تیشہ صفت کوہ بشکند — گاہے بہ جوئے شیر نوازد دلِ تپاں

کیفا دعا بکن بحضورِ خدائے پاک
بخشد بدیں قتیلِ سخن عمرِ جاوداں